UQAABI

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

آوان پروان

پنجابی افسانے

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

پنجابی افسانے

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

پنجابی افسانے

ہربھجن سنگھ
مترجم
مخمور جالندھری

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دہلی

مارچ ۱۹۷۱ء (پھاگن ۱۸۹۲)

© نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، ۱۹۷۰ء

قیمت : ۰۰/۷

KATHA PUNJAB(URDU)

تقسیم کار
(مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی)

سکریٹری نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، اے ۔ ۵۔ گرین پارک نئی دہلی نے
لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

پیش لفظ

ہندوستان ایک وسیع مُلک ہے جو اگرچہ تہذیبی حیثیت سے متحّد ہے مگر پھر بھی اُن رشتوں کو مضبُوط تر بنانے کی ضرورت ہے جن سے وہ ایک واحد، طاقتور اور ترقی پسند قوم بن سکے۔

ہمارے مُلک میں متعدّد زبانیں ہیں جو تعداد میں دُنیا کے کسی بھی مُلک میں رائج زبانوں سے زیادہ ہیں مگر بدقسمتی سے ہمیں اپنی پڑوسی زبان یا زبانوں سے نہ دل چسپی ہے نہ اُن کی معلومات، بلکہ اپنی زبانوں سے زیادہ ہمیں مغرب کی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی جرمنی وغیرہ کے سماجی و ادبی پس منظر سے واقفیت ہے۔

مُلک کے جذباتی و تہذیبی اتحاد و یک جہتی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہمارے شہری ایک دوسرے کی زبانوں کی بہترین تصنیفات سے آشنا ہوں، اور اس طرح ایک دوسرے کے طرزِ زندگی اور ادبی حصول کو قریب سے جانیں اور سمجھیں۔

مغرب میں بھی بہت سی قومیں ہیں، ہر ایک کی اپنی الگ زبان ہے مگر وہ لوگ ایک دوسرے کے فکر و ادب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں حالات اِس کے متضاد ہیں ـــــ کسی مغربی زبان میں کوئی اچھی کتاب شایع ہوتی ہے تو وہ فوراً دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں ہم ایک قوم ہوتے ہوئے، یہ تک نہیں جانتے کہ پڑوس کی زبان میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ ویسے حالات بدل تو رہے ہیں مگر اس تبدیلی کی رفتار نہایت سُست ہے۔

اِس صورتِ حال کے مدِّنظر، حکومت نے ایک اسکیم بنائی ہے کہ ہر زبان سے موجودہ یا تقریباً موجودہ زمانے کی چُنندہ کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ کی جائیں، یہ کتابیں عام دل چسپی کی ہوں گی۔ مثلاً مختصر افسانے، ناول، دل چسپ سفرنامے یا سوانح حیات وغیرہ —— ایسی مقبول تصنیفات کو ترجمہ کیا جائے گا جو کسی بھی لِسانی علاقے کی طرزِ زندگی، سماجی و تہذیبی سرگرمیوں، جذباتی کیفیتوں اور ارمانوں کی نقاب کُشائی کر سکے۔

اُمّید کی جاتی ہے کہ یہ پروجیکٹ، ہمارے مُلک کے، مختلف الزبان سماج میں، علاقائی مُفاہمت اور جذباتی یک جہتی کا کام کرے گا اور اِس مقصد میں کافی مدد دے گا۔

مختلف ہندوستانی زبانوں سے نُمایاں و مفید و دل چسپ کتابوں کا انتخاب اور پھر ترجمہ آسان کام نہیں ہے —— ہم اپنی اُن کمیٹیوں، اپنے صلاح کاروں و ترجمانوں کے مشکور ہیں جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر اِس قسم کا کوئی پلان عملی طور پر بار آور نہیں ہو سکتا تھا۔

بالکرشن کیسکر

فہرست

	مصنّف	افسانہ	صفحہ
۱۔	نانک سنگھ	تاش کی عادت	۱۷
۲۔	گوربخش سنگھ	بھابی مینا	۲۱
۳۔	سنت سنگھ سیکھوں	پیمی کے بچّے	۳۳
۴۔	گورمکھ سنگھ مسافر	ناس پیٹے	۳۷
۵۔	سُجان سنگھ	راس لیلا	۴۳
۶۔	کرتار سنگھ دوگل	کرامات	۵۲
۷۔	دیوندر ستیارتھی	دسوندھا سنگھ	۵۷
۸۔	کلونت سنگھ ورک	کھبّل	۶۹
۹۔	امرتہ پریتم	ایک حسرت ایک آہ	۷۴
۱۰۔	سنتوکھ سنگھ دھیر	صبح ہونے تک	۸۲
۱۱۔	مہندر سنگھ سرنا	چھوَیوں کی رُت	۹۰
۱۲۔	نوتیج سنگھ	قسمت کی ڈور	۱۰۰
۱۳۔	مہندر سنگھ جوشی	موتی	۱۰۸

۱۴۔ لوچن بخشی — بازار کا ماتم ۱۱۳
۱۵۔ گوردیال سنگھ — پھانس ۱۱۹
۱۶۔ اجیت کور — سولی پر لٹکے ہوئے لمحے ۱۲۸
۱۷۔ گلزار سنگھ سندھو — ٹھگی ۱۳۷
۱۸۔ دلیپ کور ٹوانہ — مرنے کا موسم ۱۴۳
۱۹۔ بوٹا سنگھ — مائی سدھراں ۱۴۷
۲۰۔ جسونت سنگھ وِردی — اپنی اپنی حد ۱۵۳
۲۱۔ موہن بھنڈاری — مجھے ٹیگور بنا دے ماں ...! ۱۵۸

پنجابی افسانہ

پنجابی افسانہ پنجابی ادب کے ساتھ ساتھ ظہور میں آیا۔ اگرچہ پنجابی ادب کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں۔ لیکن پنجابی ادب کی سمت تخلیقی ہندوستانی ادب بالخصوص شمالی ہندوستان کے ادب کے عین مُطابق رہی ہے۔ جن ایام میں ہندی زبان میں رزمیہ ادب فروغ پا رہا تھا، اُن ہی ایام میں پنجابی زبان میں رزمیہ نظمیں ظہور میں آ رہی تھیں "واراں"، یعنی رزمیہ نظمیں پنجاب کی شجاعت اور عالی ہمتی کی آئینہ دار تھیں۔ پنجابی افسانہ اسی نظم کی ہیئت کا جزوِ لاینفک ہے۔ ان رزمیہ نظموں کے ہیرو عام طور پر عوامی رہنما ہوتے تھے اور یہ نظمیں بھرے مجمع میں گا کر سنائی جاتی تھیں۔ پنجاب میں پنجابیوں کی اپنی حکومت نہیں تھی۔ شمال مغربی سرحد پر بیرونی حملہ آوروں کی یلغار جاری رہتی تھی۔ پنجاب کے دیہات کو اپنی حفاظت خود کرنی پڑتی تھی۔ جب کوئی بیرونی حملہ آور بھاری لشکر لے کر چڑھ آتا تھا تو لوگوں کو اپنے ننگ و ناموس اور عزّ و وقار کی حفاظت خود کرنی پڑتی تھی۔ جب لشکر کشی اور جارحانہ حملے کا اُمڈا ہوا پانی اُتر جاتا تو ان لڑائیوں کے سُورماؤں سے متعلق رزمیہ نظمیں گائی جاتیں۔ یہ رزمیہ نظمیں ہی سورماؤں کا لہو گرم رکھتی تھیں اور ان کو آنے والی نئی آفت اور یورش کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتی تھیں۔ ان رزمیہ نظموں کے سورماؤں، دھرتی کے بیٹوں کو لوگ عزیز رکھتے تھے۔ وہ اُن کے اپنے جانے پہچانے ہوتے تھے۔ جھوٹ، مبالغہ اور بزدلی کی گنجائش نہیں تھی۔ رزمیہ نظمیں چونکہ بھرے مجمع میں لوگوں کے سامنے گائی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان سورماؤں کی جھوٹی تعریف و توصیف ناممکن تھی۔ جنگ میں ہار جانے والے کسی سورما کی داستان نظم نہیں کی جاتی تھی۔ عوامی ہیرو، عوامی مغنّی اور سامعین ـــــ پنجابی افسانہ کے اس اوّلین روپ نے ہمیشہ کے لیے پنجابی ادب کی اس صنف کا تعیّن کر دیا۔

آج یہ رزمیہ نظمیں دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن اُن کے نقوش آج بھی گرو گرنتھ میں محفوظ ہیں۔

ب

پنجابی زبان کا سب سے قدیم اور مستند گرنتھ گرو گرنتھ ہے۔ اس گرنتھ کے حروف و الفاظ حتیٰ کہ اعراب تک بدلنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں محفوظ اشارات و کنایات ہمیں کلامِ الٰہی کی طرح عزیز ہیں۔ ملک مرید، چندر بھڑ اسوہیا، رائے کمال، ٹنڈا اسراج، للاں بہلیماں جودھا ویرا، پُوربانی، رائے مہماں حسنی اور موسیٰ وغیرہ کچھ ایسے نام ہیں جن سے متعلق رزمیہ نظموں اور شجاعت بھری کہانیوں کے نقوش گرو گرنتھ میں ملتے ہیں۔

لیکن یہ کہانیاں منظوم کہانیاں ہیں شعروں اور عوامی شاعری کے روپ میں ہیں۔ کہانی شاعری کا جزو تھی۔ اس کی اپنی کوئی منفرد ہیئت نہیں تھی۔ منفرد ہیئت کے افسانے کا آغاز گرو نانک کے عہد سے ہوا۔ گرو نانک پنجاب کے عظیم انسان تھے۔ ان کی ہمہ گیر ذہانت و فراست نے پنجاب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا۔ کہتے ہیں کہ پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ گرو نانک کو اگر پنجاب کا چھٹا دریا مان لیا جائے تو یہ بالکل مناسب ہوگا۔ اگر دریا پنجاب کی دھرتی سیراب کرتے ہیں تو گرو نانک پنجاب کے عوام کے جسم و روح اور ذہن و دل کی آبیاری کرتے ہیں۔ "پنجاب ہندو نہ مسلمان۔ پنجاب جیوندا گرودے نام" (پنجاب نہ ہندو ہے — نہ مسلمان ہے۔ پنجاب تو صرف گرو کے نام پر زندہ ہے۔) پنجابی نثر کی ابتداء بھی گرو نانک سے منسوب ہے۔ پنجابی نثر میں کہانی کا ارتقاء گرو نانک کے ساتھ ساتھ ہوا۔ اس کہانی کو "ساکھی" کہا جاتا ہے۔ ان کا ہیرو پنجاب کا عوامی ہیرو گرو نانک ہے۔ آج ہم اِن ساکھیوں کو دھارمک کہانیاں کہتے ہیں لیکن ان میں جدید افسانہ کے بیج پائے جاتے ہیں۔ گرو نانک کا شعور و ادراک فرقہ پرستی سے بالاتر تھا۔ اس لیے ساکھیوں کے مصنفین کی مذہب پرستی میں فرقہ پرستی کا عنصر موجود نہیں تھا۔ یہ کہانیاں فرقہ پرستی ہی سے نہیں بلکہ علاقہ پرستی کی بدعت سے بھی پاک ہیں۔ گرو نانک نے ہندوستان کے گوشے گوشے کا سفر کیا۔ اور وہ غیر ممالک میں بھی گھومتے رہے۔ یہ ساکھیاں مختلف لوگوں اور ان کے بود و باش کے طریقوں سے متعلق ہیں۔ ان ساکھیوں میں راجے اور اُن کے مصاحب ہیں، غریب لوہار اور بڑھئی ہیں۔ مذہب اور عرفان میں پختہ صوفی اور درویش ہیں اور مذہب و اخلاق سے عاری گرہ کٹ، بٹ مار، قاتل، چور، ٹھگ، راہزن اور راکشس ہیں۔ ہر کہانی گرو نانک سے وابستہ ہونے پر بھی زندگی کا ایک نیا جلوہ پیش کرتی ہے۔ اور زندگی کی کسی نہ کسی جبلّی گہرائی کو نمایاں کرتی ہے۔ ان میں زندگی کی نیرنگی اور تنوع ہے اور اس کی وحدت کی

گہرائی ہے۔ ساکھی اپنی ہیئت کے اعتبار سے جدید افسانہ کے بہت نزدیک ہے۔ سب سے دلآویز پہلو یہ ہے کہ ساکھی نے کہانی کو قصے اور حکایت کی روایات سے آزاد کر دیا۔ یہ ساکھیاں نہ تو مذہبی حکایات کی طرح لمبی ہیں اور نہ ان میں دیومالائی قصّوں کی طرح قارئین کو غیر معمولی حیرت و استعجاب سے دوچار کیا جاتا ہے۔ عوامی کہانیوں کی طرح ان میں صرف تفریح ہی کا عنصر نہیں ہے۔ ان کی ہیئت میں اختصار ہے اور مقصدیت کے اعتبار سے یہ گہری ہیں۔ ان میں انسانی تجربے مختصر بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔

"جنم ساکھیاں" دو ڈھائی سو سال تک لکھی جاتی رہیں۔ انہوں نے پنجابی قارئین اور مداحوں کے دلوں میں ایک نئے ذوق کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے نثری اور شعری ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ بھائی گورداس نے گیت کی صنف میں تقریباً ۲۳ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ ان میں سے گیت کو نثر میں تبدیل کر دیا جائے تو اس میں مختصر افسانے کے اوصاف نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کہانیوں کی بنیاد ذاتی تجربہ نہیں ہے بلکہ یہ مروجہ قدروں کی کہانیاں ہیں۔ لیکن ان تخلیقات کو پڑھ کر قصے اور افسانے کے درمیان جو فرق ہے نمایاں ہو جاتا ہے۔

وسطی زمانہ کے پنجابی ادب میں کہانی کے بڑے سرچشمے دو ہیں۔ پنجابی قصہ اور دسویں گرنتھ کے تریا چرتر یا "چرتر و پاکھیاں" (تذکرۂ کردار)۔ ان تخلیقات کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پنجابی ادب ازمنۂ وسطیٰ ہی میں جدیدیت کو اختیار کر چکا تھا۔ جدیدیت کی سب سے بڑی خصوصیت شخصیت اور انفرادیت کا ارتقاء ہے۔ ہمارے قدیم زمانہ میں اور وسطی زمانہ میں انسان انسان تو تھا لیکن اس کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ انسانوں میں تمیز دشوار تھی کیونکہ ہر انسان کا یکساں سماجی روپ ہوتا تھا، اور اسی روپ میں وہ اپنی پوری زندگی گزار دیتا تھا۔ یہ انسان کہانیوں کے جامد اور بے حس و حرکت اور غیر متبدّل کردار تھے اور اُن کے ارتقاء کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ تمام اعلیٰ اور کمتر کردار یکساں، سیدھے اور جامد تھے۔ وہ اپنی منفرد آرزوؤں اور تمناؤں کو پہچانتے نہیں تھے۔ ان میں کوئی تنوع نہیں تھا۔ اور وہ اپنی مخصوص شخصیت کو اُبھارنے کا کوئی شوق نہیں رکھتے تھے۔ انسان دین و دنیا کے رشتوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ان رشتوں میں تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ جہاں تک دُنیاوی رشتوں کا تعلق ہے انسان غلام تھا یا رعایا۔ جہاں تک دینی رشتوں کا تعلق ہے انسان بندۂ خدا تھا یا غلام۔ پنجابی قصہ اور تریا چرتر (عورتوں کے کردار سے متعلق) اس غلامی کے خلاف آواز ہیں۔ نعرہ ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے غلام سر بلند ہو گیا ہے اور گردن اُٹھا کر کہتا ہے "جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب اس قسم کی غلامی جاری نہیں رہ سکتی۔"

پنجاب کے قصّوں میں ازمنۂ وسطیٰ کی قدریں ٹوٹتی نظر آتی ہیں۔ بیٹیوں نے والدین کی غلامی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ بین القومی اور بین طبقاتی عشق کا آغاز ہوا (سسی پُنّوں اور سوہنی مہیوال)۔ وہ رشتے جو ممنوع تھے اُن میں بھی بحث کو فوقیت دی گئی۔ (مرزا صاحباں) عورت میں بغاوت کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ انسان اپنی انفرادیت کو نمایاں کر رہا تھا اور آزاد خیالی کا اعلان کر رہا تھا۔ "تریا چرتروں" میں عورت کی آزادہ روی نے جیسے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عورت صدیوں کی غلامی کی علامت رہی ہے۔ ایک طرف گرو گوبند سنگھ جیسے عوامی سورماؤں نے مجبور و بیکس لوگوں کو سلطانوں اور بادشاہوں کی غلامی سے نجات دلائی اور دوسری طرف ادبی تخلیقات میں حرّیت و آزادی کا جذبہ انگڑائی لیتا رہا۔ پیکارِ حیات کے ساتھ ساتھ ادب کی جنگ جاری رہی۔ عشقیہ داستانوں کی ہیر، سوہنی، سسّی اور "چرتر و پاکھیان" کی عورت غلامانہ ذہنیت کی بنیادوں پر تعمیر کئے گئے انسانی رشتوں کو للکار رہی تھیں۔ یہ للکار جس خوبصورتی سے کہانی کے ذریعہ سے بلند کی جا سکتی ہے ادب کی کسی اور صنف کے ذریعہ سے نہیں کی جا سکتی۔ یہ قصّے پنجاب کی عوامی زندگی میں اپنے باغی جذبہ کے ذریعہ سے بہت گہرے اُتر گئے ہیں۔ پنجابی افسانہ کی بغاوت کچھ منہدم کرتی ہے اور کچھ تعمیر کرتی ہے۔ "تریا چرتروں" میں پُرانی قدریں منہدم ہو جاتی ہیں، اور عشقیہ افسانوں میں نئے حقوق کے لیے جد و جہد کو فروغ دینے کی کوشش موجود ہے۔ عصرِ جدید کے آغاز سے پہلے ہی پنجابی ادیبوں کو قدروں کی تخریب اور تعمیر کا ورثہ مل چکا تھا۔ ان کہانیوں کے اہم ترین محاسن انسان دوستی اور حبّ الوطنی ہیں۔ پنجاب میں اوتاروں کے تصور کو فروغ پانے کا موقع نہ ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصیبت کے وقت انسان خدا کو یاد تو کر سکتا ہے لیکن اُسے دعوت دے کر زمین پر نہیں بُلا سکتا۔ انسان کو اپنی مصیبت دُور کرنے کے لیے خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ "اوتار کے روپ میں انسان" کی کہانی کا انجام ہمیشہ فتح ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی کہانی کا انجام فتح بھی ہو سکتا ہے اور شکست بھی۔ نتیجتہً کہانی کو تنوع حاصل ہوا اور گہرائی بھی۔ انسان کے تئیں اوٹ وفا کی بدولت ہی پنجابی کہانی ازمنۂ وسطیٰ میں بھی جدید رنگ کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

جدید پنجابی ادب کا بانی ویر سنگھ کو مانا جاتا ہے۔ ویر سنگھ نے پنجابی زبان میں بہت سے ناول لکھے۔

یہ ناول دراصل طویل افسانے ہیں۔ پنجابی زبان اور اس کے ورثہ سے پوری وفاداری کرتے ہیں ۔ "سندری" اور "ستونت کور" نام کے ناول بنیادی طور پر مذہبی رنگ کی حامل تخلیقات ہیں۔ لیکن ان کی کہانی انسان کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے۔ اِن میں انسان کے پاؤں زمین پر ہی جمے رہتے ہیں لڑکھڑتے نہیں ہیں۔ بے پناہ مصیبت اور بے خوف بغاوت ان کہانیوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ جدید اور مختصر افسانہ کا آغاز نانک سنگھ سے ہوتا ہے۔ نانک سنگھ ہی کو اس کا آغاز تسلیم کیا گیا ہے۔ نانک سنگھ کے زمانہ تک متوسط طبقہ کی عکاسی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ متوسط طبقہ کی آئینہ داری کا اہم ترین پہلو اس کا لچکیلا پن ہے۔ اس طبقہ کی وفا اور اس کا خلوص آخری اور قطعی نہیں۔ اس طبقہ کو نئے رشتے قائم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ نانک سنگھ کا رُخ شہر کی طرف ہے۔ اس کی کہانی شہری زندگی کی طرح رنگا رنگ اور متنوع ہے۔ نانک سنگھ کی کہانی انسانوں کے پائیدار طور و اطوار کی کہانی نہیں۔ انسان کے نئے جذبوں اور نئے ارمانوں کی کہانی ہے۔ اس میں نہ پرانی بغاوت ہے۔ نہ پرانی جذباتی محبت۔ ان کہانیوں کا رُخ نہ آلام و مصائب کی طرف ہے نہ مذہب کی طرف اور نہ خالص جسمانی ضروریات کی طرف ہے۔ نانک سنگھ کے پاس گہری فکر و نظر اور فلسفۂ حیات بھی نہیں ہے۔ اس کی کامیابی کا راز متوسط طبقہ کی سیدھی سادی عکاسی میں مضمر ہے۔ اَن جانے میں اور لاشعوری طور پر اس نے پنجابی ادب کے نظریہ کو ان گنت مجبوریوں سے آزاد کیا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل کہانی "تاش کی عادت" درمیانہ طبقہ کی زندگی پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہی طرزِ حیات نانک سنگھ کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ دراصل پنجابی ادب کی ابتدا ہی اس درمیانی نقطہ سے ہوتی ہے۔

نانک سنگھ کے بعد پنجابی افسانہ میں ممتاز ترین نام گوربخش سنگھ کا ہے۔ گوربخش سنگھ ہمارے افسانہ کو کچھ آگے اور کچھ پیچھے لے جاتا ہے۔ اُس نے کہانی کو نظریۂ حیات سے وابستہ کر دینے سے اسے نئی گہرائی عطا کی۔ لیکن اس کے متوسط طبقہ کی ذہنیت نانک سنگھ کی طرح سیدھی سادی نہیں۔ اُس نے اپنے پاؤں جذباتیت کے حامل، آدرش میں اور سطحی حقیقت پسندی میں جما رکھے ہیں۔ درمیانہ طبقہ کی زندگی حقیقت اور آدرش کی کشمکش سے بھری زندگی ہے۔ کہانی عام طور پر کشمکش سے شروع ہو کر کشمکش پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ نانک سنگھ کی کشمکش کا رُخ روزمرہ کے حقائق کی طرف رہتا ہے۔ گوربخش سنگھ کی کشمکش کا رُخ جذباتیت کے آدرش کی جانب رہتا ہے۔ متوسط طبقہ جن تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے

میں قاصر رہتا ہے گوربخش سنگھ ان ارمانوں کو آدرش کی حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ ان کے یہاں سچی محبت اور مادّیت پسندی کے درمیان کشمکش پائی جاتی ہے۔ اُس نے نہ تو محبت کے جسمانی پہلو کو اپنایا ہے اور نہ مادّیت پسندی کے نظریہ کو۔ اس کی کہانیاں انسان کے حالات کی نسبت زیادہ تر انسان کی جذباتیت سے وابستہ ہیں۔ نانک سنگھ اور گوربخش سنگھ دونوں کے اشتراک نے پنجابی افسانہ کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ کہانی حق وصداقت، جذبہ واحساس اور حقیقت و مجاز تک پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

پنجابی کہانی کو کرتار سنگھ دوگل اور سنت سنگھ سیکھوں نے استحکام اور دوام بخشا۔ جذباتیت سے بے نیاز محسوسات کی کہانی میں سیکھوں عدیم النظیر ہے۔ "یمی کے بچے"، "اور پھر بیوہ!" اس کی دو لامثال کہانیاں ہیں۔ سیکھوں مارکس وادی دانشور کی حیثیت سے مشہور ہے۔ پنجابی ادب کو شعور و نظریہ کی ٹھوس بنیاد عطا کرنے میں سیکھوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ کہانی بیان کرتے ہوئے اس کا شعور وادراک کہانی میں مداخلت نہیں کرتا۔ لیکن غیر ارادی طور پر اور ڈھکے چھپے انداز میں وہ کہانی کے ماحول میں ضرور جاری وساری رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہانی میں شعور وادراک بھی برقرار رہتا ہے اور اس کی روانی بھی۔

کرتار سنگھ دوگل پنجابی زبان کا عظیم افسانہ نگار ہے۔ اُس نے ناول بھی لکھے ہیں اور ڈرامے بھی۔ شعروشاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور کبھی کبھی قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے تنقیدی دنیا کی سیر بھی کی ہے لیکن وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی زیادہ مشہور ہے۔ اُس نے پنجابی زبان میں باقاعدگی سے افسانہ نگاری کی پیہم ریاضت کی ہے۔ پنجابی عوام کے جذبات ومحسوسات کی گذشتہ تیس سال کی تاریخ دوگل کی کہانیوں میں ملتی ہے لیکن ڈھکے چھپے انداز میں کیونکہ دوگل اوّلین طور پر افسانے کا وفادار ہے۔ کسی خاص تحریک یا کسی خاص فکروخیال کا وفادار نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا غلام ملک، دوسری عالمی جنگ، ۱۹۴۷ء کی تباہی اور غارت گری، ہندوستان کی جذباتی یگانگت، ملک کی تقسیم، ترقی پسندی، ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ان سب کا جذباتی ردِعمل دوگل کی کہانیوں میں ملے گا۔ اس کے افسانوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں لیکن وہ ان کو بڑی آگہی اور چابکدستی سے پیش کرتا ہے۔ دوگل چونکہ حقیقی زندگی کا وفادار ہے اس لیے اُس کی کہانیوں میں یکطرفہ رُجحان کے آثار نہیں ملتے ہیں وہ نفسیات اور مارکسزم دونوں سے آگاہ ہے لیکن وہ کئی بار ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو عام تجربوں سے میل نہیں کھاتی ہیں۔ اس کی کہانیوں میں جرأت وبیباکی اور رچاؤ اور گٹھاؤ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مجموعی طور پر دوگل کی کہانیاں ایک صحت مند اور توانا انسان

کا ردِعمل ہیں۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم نے پنجابی افسانہ کو خاص طور سے متاثر کیا۔ اس تقسیم نے پنجاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چند افسانہ نگار گورمکھ سنگھ مسافر، کرتار سنگھ دوگل، کلونت سنگھ ورک، مہندر سنگھ سرنا، دیوندر ستیارتھی اور لوچن بخشی مغربی پنجاب سے اُکھڑ کر آئے تھے۔ ذاتی طور پر تباہ و برباد ہونے کے باوجود ان ادیبوں کی کہانیوں میں گہری یگانگت ہے۔ ان کی کہانیوں میں تاریخی تلخی سرے سے ہی غائب ہے۔ یہ ایک لمحہ کی کہانیاں ہیں۔ ان میں پنجاب کے کردار کو متوازن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی چار کہانیاں "ناس پیٹے"، "جھار جھنکار"، "چھویوں کی رُت" اور "موتی" تقسیم وطن سے متعلق ہیں، لیکن یہ تمام کہانیاں وقت، مقام اور سانحۂ عظیم کے تعصب سے پاک ہیں۔ ان کہانیوں میں تلخی کی تہ دبیز نہیں ہے۔ جتنی بھی تلخی ہے وہ حالات اور اُس زمانہ کے کردار سے متعلق ہے۔ ان کہانیوں میں اس تباہی و غارت گری کی ذمہ داری ایک فریق کے سر منڈھنے کا رُجحان بالکل نہیں پایا جاتا۔ یہی صحت مند پنجابیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی افسانہ پنجاب سے متعلق ہوتے ہوئے بھی حقیقی انسانیت سے رشتہ جوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ہربھجن سنگھ

نانک سنگھ

تاش کی عادت

"رحیمو!"

شیخ عبدالحمید سب انسپکٹر نے گھر کے دروازے میں قدم رکھتے ہی نوکر کو آواز دی۔ "ذرا بشیر کو میرے کمرے میں بھیج دو۔" اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا اپنے پرائیویٹ کمرے میں پہنچا۔ کوٹ اور پیٹی اُتار کر انہیں کھونٹی پر ٹانگ دیا اور وہ میز کے سامنے جا بیٹھا۔ میز پر ایک انبار بکھرا پڑا تھا۔ ایک کونے میں موٹی پتلی قانونی اور غیر قانونی کتابوں اور کاغذوں سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی فائلیں پڑی تھیں۔ بیچ میں قلمدان اور اُس کے قریب ہی آج کی آئی ہوئی ڈاک پڑی تھی جن میں پانچ چھ لفافے، دو تین پوسٹ کارڈ اور ایک دو اخبار بھی تھے۔ پن کشن، بلاٹنگ پیپر ویٹ، ٹیگوں کا ایک گچھا اور اس قسم کا بہت سا الّم غلّم جگہ جگہ پڑا تھا۔

شیخ جی نے بیٹھتے ہی دُور کی عینک اتار کر میز کے سامنے کی جگہ پر جو ذرا خالی تھی رکھ دی اور نزدیک کی عینک لگا کر ڈاک دیکھنے لگے۔

انھوں نے ابھی دو ہی لفافے کھولے تھے کہ پانچ برس کا ایک لڑکا اندر آتا دکھائی دیا۔ لڑکا دیکھنے میں بہت ہی چست و چالاک اور شریر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن باپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی حرکات و سکنات بالکل تبدیل ہو گئیں۔ شوخ اور پھُرتیلی آنکھیں جھک گئیں اس کے بدن میں جیسے جان نہ رہی۔

"سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" ایک طویل خط پڑھتے ہوئے شیخ جی نے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔

لڑکا ڈرتے ڈرتے سامنے بیٹھ گیا۔

"میری طرف دیکھو۔" خط پر سے اپنی توجہ ہٹاتے ہوئے شیخ جی گرجے۔ "سنا ہے کہ تم آج تاش پھر کھیلتے رہے ہو؟"

"نہیں ابا جی" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ڈرو نہیں" شیخ جی نے اپنی عادت کے برعکس کہا۔ "سچ سچ بتا دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے تمہیں خود دیکھا تھا۔ عبداللہ کے بیٹے کے ساتھ۔ تم اُن کے دالان میں کھیل رہے تھے۔ بتاؤ۔ تم تاش کھیلتے رہے ہو کہ نہیں؟"

لڑکے نے مُنہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شاباش" شیخ جی نرمی سے بولے "میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے آخر سچ تو بولا۔ اصل میں بشیر۔ میں نے تمہیں خود تو نہیں دیکھا تھا لیکن کسی سے سنا تھا۔ یہ تو تم سے اقبالِ جرم کرانے کا ایک طریقہ تھا۔ بہت سے ملزموں سے میں یوُں ہی سب کچھ اگلوا لیا کرتا ہوں۔ خیر۔ آج تمہیں کچھ ضروری باتیں سمجھانی ہیں۔ ذرا غور سے سنو"

یہ کہہ کر انھوں نے بشیر کی طرف دیکھا جو اپنے والد کی عینک تھام کر اُس کی کمانیاں نیچے کر رہا تھا۔ شیخ جی اُس کے ہاتھوں سے عینک لے کر فائل میں سے ایک وارنٹ کا مضمون دل ہی دل میں پڑھتے ہوئے بولے۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک گناہ بہت سے گناہوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ تاش کھیلنے کا گناہ چھپانے کے لیے تمہیں جھوٹ بولنا پڑا۔ یعنی تم نے ایک کی جگہ دو گناہ کیے"

شیخ جی نے وارنٹ کو فائل میں دوبارہ نتھی کرتے ہوئے بیٹے کی طرف دیکھا۔ بشیر پِن کُشن میں سے پن نکال کر ٹیبل کلاتھ میں گاڑ رہا تھا۔

"میری طرف توجہ دو" اس کے ہاتھ سے پن چھین کر شیخ جی ایک اخبار کے ورق اُلٹتے ہوئے بولے۔ "تاش ایک قسم کا جُوا ہوتا ہے۔ جوا۔ اس سے بڑھ کر آدمی کو جوے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ سنا تم نے۔ ! اور یہ عادت صرف اپنے تک محدود نہیں رہتی ہے بلکہ ایک آدمی سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو لگ جاتی ہے، جیسے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔"

بشیر قلمدان میں اپنی اُنگلی ڈبو کر اور اس پر سیاہی لگا کر ایک کورے کاغذ پر بیل بوٹے بنا رہا تھا۔ خربوزے کا نام سُنتے ہی اُس نے اپنی اُنگلی کی سیاہی میز کی نچلی پٹی سے پونچھ ڈالی اور اپنے والد کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے سچ مچ کوئی ہاتھ میں خربوزہ لیے بیٹھا ہو۔

"بشیر" شیخ جی اس کے آگے رکھے قلمدان کو اُٹھا کر پرے رکھتے ہوئے بولے "میری بات غور سے سنو" وہ ابھی اتنی سی بات کہنے پائے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شیخ جی نے اُٹھ کر رسیور

تھام لیا۔" ہیلو — آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ بابو پرشوتم داس..... آداب عرض! کہیے کیا حکم ہے۔ لاٹری کے ٹکٹ.....؟ اوہ میں آج شام پُر کر کے بھیج دوں گا — پانچ ٹکٹوں کے کتنے روپے — پچاس؟ خیر — لیکن آج تک نکالی بھی ہے —؟ قسمت جانے کب جاگ پڑے۔ آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں — اچھا آداب عرض!"

رسیور رکھ کر وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھے اور بولے — "دیکھو — شرارت نہ کرو۔ پیپرویٹ نیچے گر پڑا تو ٹوٹ جائے گا۔ اسے رکھ دو اور میری بات غور سے سنو۔"

"اچھا تو میں کیا کہہ رہا تھا —" شیخ جی نے ایک اور فائل کا فیتہ کھولتے ہوئے کہا — "تاش کی بُرائیاں بیان کر رہا تھا۔ تاش سے جُوا — جُوئے سے چوری — معلوم ہے کہ چوری کے بعد کیا حاصل ہوتا ہے؟" وہ بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے — "جیل یعنی قید کی سزا۔"

بشیر فائل میں سے نکلے ہوئے ایک پیلے کاغذ میں قلم کی نوک سے چھید ڈال رہا تھا۔

"نالائق — پاجی —" شیخ جی نے اُس کے ہاتھ سے قلم کھینچتے ہوئے کہا "چھوڑ دان بیکار باتوں کو۔ تم میری بات غور سے سُنو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں ہر روز کتنے چوروں کا چالان کرنا پڑتا ہے؟ اور یہ سب کے سب چور تاش کھیل کر ہی چوری کرنا سیکھتے ہیں۔ اگر قانون کا ڈنڈا ان کے سر پہ نہ ہو تو نہ جانے یہ کیا قیامت برپا کر دیں —" اور شیخ جی نے میز کے ایک کونے پر پڑی کتاب تعزیراتِ ہند کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن بشیر کی نظر ایک اور کتاب پر تھی۔ اُس کے بالائی گتے پر سے جلد کا کپڑا تھوڑا سا اُکھڑا ہوا تھا۔ اسے کھینچتے کھینچتے بشیر نے جلد کو آدھا ننگا کر دیا تھا۔

"بے وقوف — گدھا —" شیخ جی کتاب اس کے نزدیک سے اُٹھا کر دُور رکھتے ہوئے بولے — "میں نے تمہیں جلد اُدھیڑنے کے لیے نہیں بلایا تھا۔ غور سے سُنو —" کچھ سمنوں پر دستخط کرتے ہوئے اُنہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا — "ہم پولیس افسروں کو سرکار جو اتنی تنخواہیں اور پینشنیں دیتی ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ کیوں دیتی ہے۔ اس لیے کہ ہم ملک میں جرائم کا انسداد کریں۔ اگر ہمارے ہی بچے تاش اور جوا کھیلنے لگیں تو دُنیا کیا کہے گی اور ہم کیسے نمک حلالی کا ثبوت....."

ابھی وہ بات ادھوری ہی تھی کہ عقبی دروازے سے ان کا ایک دراز قد نوکر اندر آیا۔ وہ سپاہی تھا۔ شیخ جی اُس جیسے دو تین وفادار سپاہی گھر میں ہمیشہ رکھا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک مویشیوں کو چارہ ڈالنے اور بھینیں دوہنے کے لیے تھا۔ دوسرا رسوئی میں مدد دینے کے لیے تھا۔ تیسرا جو اندر چلا آیا تھا۔ وہ اسامیوں سے رقم بٹورنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اُس نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا

"وہ آئے بیٹھے ہیں۔"

"کون؟"

"وہی بگھی بدمعاش کے آدمی۔ جنھوں نے دسہرے کے میلہ پر جُوا خانہ کھولنے کی درخواست کی تھی۔"

"تم اُن سے خود ہی بات کر لیتے۔"

"میں نے تو اُن سے کہہ دیا تھا کہ شیخ جی ڈھائی سو سے کم پر کسی طرح نہیں مانتے۔ لیکن ــــ"

"پھر وہ کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایک بار شیخ جی کی قدمبوسی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو دو منٹ کے لیے چلے چلیے۔ بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا چلو ــــ" یہ کہہ کر جب شیخ جی اُٹھنے لگے تو اُنھوں نے بشیر کی طرف دیکھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ اگر وہ اُسے فوراً ڈانٹ ڈپٹ کر جگا نہ دیتے تو اس کی پیشانی میز سے ٹکرا جاتی۔

"جاؤ ــ جا کر آرام کرو ــــ" شیخ جی کوٹ اور بیلٹ سنبھالتے ہوئے بولے ــــ "باقی نصیحت تمہیں شام کو دوں گا۔ اب پھر تاش نہ کھیلنا۔"

وہ باہر چلے گئے۔ لڑکے نے اُٹھ کر ایک دو انگڑائیاں اور جماہیاں لیں، آنکھیں ملیں اور پھر ناچتا اور اُچھلتا باہر نکل گیا۔

گوربخش سنگھ

بھابی مینا

شہر کی ایک گلی کے آمنے سامنے واقع دو مکانوں کے درمیان مشکل سے تین ساڑھے تین گز کا فاصلہ تھا۔ پہلی منزل پر دو کھڑکیاں بھی آمنے سامنے ہی کھلتی تھیں۔ ایک میں سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑا آئینہ لٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ باقی چیزیں اس کمرے میں کچھ کم ہی تھیں۔ ایک چارپائی — ایک مونڈھا، ایک طاقچے میں دو چار کتابیں۔ کنگھی، تیل، دیوار پر ایک دو تصویریں۔ ٹوکری میں دو چار کپڑے۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اور اس میں ایک عورت کے سوا کوئی اور صورت بہت کم دیکھی گئی تھی۔ وہ کبھی کشیدہ کاڑھتی۔ کبھی کتاب پڑھتی۔ کبھی یوں ہی بیٹھی ہوتی۔ اور کبھی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں دیر تک کنگھی کرتی رہتی۔ اور وہ بالوں میں کنگھی کئی بار کیا کرتی تھی۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ اُسے کنگھی کرنے کا جنون تھا۔

اس کے بال بہت لمبے تھے۔ جب وہ اُنھیں کھول کر اُن کی لمبائی خود دیکھتی تو وہ اس کے ٹخنے چھونے لگتے۔ اگر کسی نے ان کو روشنی میں دیکھا ہوتا تو ان کی چمک کا اسے اندازہ ہوتا۔ لیکن اس میں ذرا سا بھی شک نہیں تھا کہ اُسے اپنے بالوں پر بہت ناز تھا۔

وہ جوان تھی — دل کش اور لمبی — اُس کی آنکھوں کا رنگ سامنے کی کھڑکی میں سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا لیکن ان کا پرتو رسیلا اور افسردہ تھا۔

وہ دیر تک اپنی کھڑکی میں بیٹھی آنسو بہاتی تھی۔ کبھی کسی نے اُسے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر جھانکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن گلی والوں کو اس کی موجودگی کا احساس ضرور رہتا تھا اور کبھی کوئی قریب سے آتی جاتی عورت اُسے آواز بھی دے دیتی تھی اور وہ بہت ہی میٹھے لہجے میں ذرا سی جھک کر جواب دیا کرتی تھی۔

جب وہ کمرے میں نہیں ہوتی تھی تو کھڑکی بند رہا کرتی تھی۔ لیکن سردیوں میں شام کو

اور گرمیوں میں دوپہر کے بارہ بجے وہ ضرور کھلا کرتی تھی اور اُس کھڑکی میں ذرا سی کروٹ لے کر وہ بیٹھی ہوتی تھی اور کبھی کبھی گلی میں جھانک لیا کرتی تھی۔

اُس وقت ایک لڑکا جو بچہ معلوم ہوتا تھا گلی کا موڑ مڑتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ کام چھوڑ کر کھڑکی کی سلاخوں میں سے اُدھر دیکھتی رہتی۔ وہ لڑکا بھی کبھی کبھی اوپر دیکھتا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہو جاتا۔ اس کے سیڑھیاں چڑھنے کی کھٹ کھٹ اس عورت کے کانوں میں بجتی رہتی۔ وہ کبھی اس گھر میں نہیں گئی تھی لیکن اُسے ان کی سیڑھی کے چبوتروں کی گنتی یاد تھی۔ سیڑھی کے ہر چبوترے پر پڑتے ہوئے قدموں اور ان کی آواز کو اُس نے کئی بار اپنے سینے سے لگایا تھا۔

دوسرے مکان میں جب کوئی دروازہ کھلتا تو اُس طرف دیکھے بغیر وہ محسوس کر لیتی تھی کہ سامنے کی بیٹھک میں کون داخل ہوا ہے۔

وہ لڑکا بستہ ایک طرف رکھ کر اور کچھ دیر کے لیے اپنی کھڑکی میں کھڑا ہو کر سامنے کی کھڑکی کی طرف دیکھتا۔ وہ عورت اُدھر نہیں دیکھتی تھی۔ لیکن اُسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ایک طرف وہ آنکھیں لگی رہتی ہیں جن کی راہ وہ ہر روز تکتی رہتی تھی۔ اور اگر کسی دن اُس کو اسکول سے آتے ہوئے دیر ہو جاتی تو وہ دوسرے آنے والے لڑکوں سے یہ پوچھنا چاہتی ـــــ "کاکا کیوں نہیں آیا" ـــــ لیکن اُس نے کبھی یہ پوچھا نہیں تھا۔

کاکا (پیار سے چھوٹے لڑکے کو کہتے ہیں) بیٹھک کا دروازہ بند کر کے کوٹھے پر چڑھ جایا کرتا تھا۔

کتنا ہی عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ کاکا اب تیرہ برس کا ہو رہا تھا۔ سامنے کی کھڑکی میں اُس کی دل چسپی اُسے زیادہ لطف انگیز محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک دن اُس نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"ہمارے یہاں سب آتے ہیں۔ لیکن سامنے کے گھر سے کبھی کوئی کیوں نہیں آیا؟"

"کاکا ـــ ہماری گلی میں بھابڑوں (جینیوں) کا یہ واحد مکان ہے۔ یہ لوگ ماس (گوشت) سے بہت پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے یہ سکھوں سے کوئی میل جول نہیں رکھتے۔

"لیکن ماں ـــ ہم تو ماس نہیں کھاتے"

"یہ سمجھتے ہیں کہ سارے سکھ ماس کھاتے ہیں"

"کیا یہ گھر سے باہر بھی نہیں نکلتے؟"

"نکلتے ہیں ... مگر یہ ایک دُکھیارا سا گھر ہے۔ موت نے اس گھر میں تباہی مچا دی ہے۔ ایک ہی بیٹا رہ گیا تھا۔ اس کا بیاہ کر دیا گیا مگر دو برس ہوئے وہ بھی مر گیا۔ اس کی موت کے بعد ایک بچہ

ہوا لیکن وہ بھی سال بھر زندہ نہ رہا ـــــ اب تینوں رانڈیں رونے دھونے کے لیے رہ گئی ہیں۔"

"وہ بچّہ کس کا تھا؟"

"مینا کا ـــ جسے تو نے کئی بار کھڑکی میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہوگا۔"

"ماں وہ ہر وقت کھڑکی میں کیوں بیٹھی رہتی ہے؟"

"وہ لوگ جوان اور بیوہ بہوؤں کی بڑی رکھوالی کرتے ہیں .... اور گھر میں کام کوئی زیادہ نہیں ہے۔"

"وہ رکھوالی کیوں کرتے ہیں؟"

"یوں ہی ـــ کسی سے گھر کی کوئی بات کہہ دیں گی۔ وہ خوش جو نہیں رہتی ہیں۔"

"ماں ـــ گھر میں جتنی عورتیں آتی ہیں تم مجھ سے کہتی ہو کہ میں کسی کو چچی کہوں، کسی کو موسی، اور کسی کو پھوپھی کہوں ـــ اگر وہ مجھ سے کبھی ملے تو میں اُسے کیا کہوں؟"

"کون ـــ مینا؟"

"ہاں ـــ جو کھڑکی میں بیٹھی رہتی ہے۔"

"وہ تیری بھابی ہے ـــ اُس کا شوہر تیری گلی کا بھائی ہوتا تھا۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔"

"یہ مینا بھلا کیسا نام ہوا؟"

"کیا تجھے اچھا نہیں لگتا؟"

"نہیں ـــ بہت اچھا لگتا ہے ـــ لیکن میں نے پہلے کبھی ایسا نام نہیں سنا۔ مینا وہی ہوتی ہے نا جو ماما جی کے گھر پنجرے میں سے بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی ہے؟ طوطا اتنی خوبصورتی سے نہیں بولتا۔"

"ہاں ـــ وہی ـــ"

"ماں ـــ کیا تم مجھے ایک مینا لے دو گی؟"

"بیٹا ـــ تم اپنے ماما جی سے ہی کہنا۔"

چند دنوں کے بعد اس کی بیٹھک میں ایک پنجرا ٹنگا ہوا تھا۔ جب وہ کوٹھے پر جاتا تو یہ پنجرہ اپنے ساتھ لے جاتا۔

لڑکے نے اپنی مینا سے کہا ـــ "بھابی مینا کھڑکی میں بیٹھی ہے!"

کھڑکی والی مینا نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُسے بہت ہی اچھا لگتا تھا جب مینا کہتی تھی

"بھابی مینا کھڑکی میں بیٹھی ہے!"

جاڑے کی راتوں میں بھابی مینا اپنے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ امتحان نزدیک آجانے پر وہ بھی کچھ دنوں سے اپنی بیٹھک میں سونے لگا تھا۔ بھابی مینا کو کئی بار سوئے پڑے لڑکے کے سانسوں کی آواز آیا کرتی تھی۔ وہ چارپائی سے اُٹھ کر بڑی دیر تک وہ آواز سنتی رہتی تھی۔

اب اُس کی عمر پچیس برس کی ہونے لگی تھی۔ "کاکا" ابھی پورے تیرہ برس کا نہیں ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچا کرتی تھی کہ کاش مجھے اس بچے سے بات کرنے کی آزادی ہو، میں اُس کے اسکول سے واپس آنے پر اُسے کھڑکی میں سے سر نکال کر دیکھ سکوں، میں اُس سے بات کر سکوں، اور جب کبھی وہ بیمار پڑے اس کے گھر جا کر اُس کی چارپائی پر بیٹھ سکوں، بیماری میں کسی قسم کی خرابی کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

پھر وہ خود ہی کہہ اٹھتی —— مجھے اتنی آزادی کون دے گا، میں اس کمرے ہی میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ میرے بال میری ساس کی طرح جھڑ جائیں گے۔ کاکے کی شادی ہو جائے گی، پھر یہ کھڑکی یوں کھلی نہیں رہا کرے گی۔ پھر میں کس انتظار میں اس تاریک زندگی کے لمبے دن اور لمبی راتیں کاٹ سکوں گی۔

یہ سوچ کر اس کے کلیجے پر چھری سی چلنے لگی۔ وہ بستر پر سے اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ چاندنی رات تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے تھوڑی سی روشنی کاکے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ کاکا گہری نیند سویا پڑا تھا۔ وہ لمبے سانس لے رہا تھا۔ مینا کے دل میں ایک اُبال سا اٹھا۔ اس نے یہ اندازہ لگایا کہ دونوں گھروں کے درمیان فاصلہ کتنا تھا۔ کاش کھڑکی کی دونوں چوکھٹوں پر چارپائی ڈال کر ایک پُل بنا سکوں۔ میں کاکے کے پاس پہنچ جاؤں —— میں اسے جگاؤں گی نہیں —— دور سے اُس کا مُنہ چوم کر واپس چلی آؤں گی۔

لیکن نہ تو وہ فاصلہ اتنا کم تھا اور نہ اُس کی آرزو کے برابر اُس کی ہمت تھی۔ وہ واپس آکر چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کاکے کی بیٹھک میں سے آواز آئی "بھابی مینا....." وہ چونک کر پھر اٹھی۔ لیکن وہ پنجرے کی مینا کی آواز تھی۔ کاکا اُسی طرح سویا پڑا تھا۔

عین اُس وقت مینا کی ساس رفعِ حاجت یا پیشاب کرنے کے لیے اُٹھی تھی۔ اُس نے مینا کے کمرے میں آہٹ سُنی اور اُسے یہ گمان بھی ہوا کہ اُس نے "بھابی مینا ..." جیسی کوئی آواز بھی سُنی تھی۔ اُس نے مینا کو آواز دی۔ مینا نے فوراً جواب دیا۔ اس کی ساس کا شک مضبوط ہو گیا۔

"کیا تو سوئی نہیں مینا۔ رات آدھی گزر چکی ہے۔"

"یوں ہی آنکھ کھل گئی تھی۔"

"تو کسی سے باتیں کر رہی تھی؟"

"میں کس سے باتیں کر سکتی ہوں۔"

ساس نے سامنے کی کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"وہ تو سرداروں کا کاکا ہے۔ غافل سویا پڑا ہے۔" مینا نے کہا۔

ساس چلی گئی — کاکا اگرچہ بچّہ تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ بھولا بھالا تھا، لیکن مرد تو تھا — بیوہ عورتوں کا کیا کام کہ وہ بچوں کی طرف بھی دیکھ سکیں!

مینا اسکول سے واپس آتے ہوئے کاکے کی طرف دیکھتی ہے — کاکا بھی آتا بعد میں ہے پہلے بیٹھک میں جاتا ہے اور کھڑکی کھلی رکھتا ہے — اور وہ پچھلے سال سے زیادہ بڑا بھی معلوم ہوتا ہے۔

یہ باتیں نظر انداز کرنے والی نہیں تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی بدلیاں کبھی کبھی کالی گھٹا بن جایا کرتی ہیں۔

آج جب کاکا اسکول سے آیا تو مینا کی کھڑکی بند تھی۔ رات کو بھی وہ کھڑکی بند رہنے لگی۔

یہ کھڑکی کاکے کی زندگی کا ایک حصّہ بنتی جا رہی تھی۔ اب اُس کا جی کھیل کود میں زیادہ نہیں لگتا تھا۔ ماں سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس گھر سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھار شادی بیاہ کے موقع پر بھاجی دینے اور لینے کے لیے ہی دہلیزیں پار کی جاتی تھیں۔

آج کی رات تاریک تھی۔ مینا کی کھڑکی کے قریب کچھ کھسر پھسر ہوئی جیسے کوئی چابیاں بدل بدل کر تالا کھول رہا ہو۔

پھر کھڑکی آہستہ سے کھُلی۔ مینا نے اُٹھ کر کان لگا کے یہ سنا کہ گھر میں کہیں کوئی آہٹ تو نہیں ہوئی۔ پھر اُس نے گلی میں جھانک کر دیکھا — پھر اُس نے کاکے کے سانس کی آواز سُنی — کاکا سویا پڑا تھا۔ اُس اندھیرے میں اور کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن مینا کی پیار ٹٹولتی آنکھیں کاکے کا انگ انگ دیکھ رہی تھیں۔

دوسرے لمحے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کاکے کی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اور اس کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اُسے جگا رہی تھی — مینا کے کان میں اس کی اپنی ہی آواز پڑی۔

"کاکا — کاکا — کاکا —"

وہ اب بھی سویا پڑا تھا — وہ اُس سے کہہ رہی تھی — "کاکا — تیری بھابی مینا —

ایک پل کے لیے جاگ جاؤ ـــــ ایک پل کے لیے جاگ جاؤ ـــــ ایک لفظ ـ ایک بات ـــــ ایک لفظ ـــــ ایک بات ـــــ اور پھر بس ....."

کاکا ہڑبڑا کر اٹھا ـــــ

مینا کو بڑی شرم آئی ـــــ اب اُسے پتہ چلا کہ وہ دل ہی دل میں نہیں بلکہ اپنے منہ سے بول رہی تھی ـــــ اور کاکا جاگ پڑا تھا ۔ اور اگر کوئی اور بھی جاگ پڑا تو .....

کاکا اپنی کھڑکی میں آ بیٹھا ۔ اُسے بھی کھڑکی کے اندھیرے میں بھابی مینا بیٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ۔ اُس نے کئی بار بھابی مینا سے بغلگیر ہونے کی کوشش کی تھی ۔ وہ بہت اُداس رہنے لگا تھا کہ کھڑکی کیوں بند رہنے لگی تھی ۔

"بھابی مینا ـــــ بھابی مینا "

"ہاں کاکا ـــــ میرا اچھا اور پیارا کاکا ـــــ لیکن ذرا آہستہ ـــــ میں تیری دبی سے دبی آواز بھی سن لوں گی ۔"

"مجھے بھی تمہاری آواز صاف سنائی دے رہی ہے ۔ تم بہت آہستہ بولتی ہو "

"ہاں ـــــ میرے پیارے "

"تم اتنے دن کہاں رہیں ؟"

"میرا کمرہ حوالات بنا دیا گیا ہے ۔ اس کھڑکی پر تالا جڑ دیا گیا ہے "

"مگر کیوں ؟"

"اُس دن تیری مینا نے آواز دی تھی ۔ میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی ۔ مجھے یہ گمان گزرا کہ وہ تیری آواز تھی ۔ میری شامت کے لیے میری ساس بھی اس وقت اٹھ بیٹھی تھی ۔ اُسے یہ شک ہوا کہ میں تجھ سے باتیں کر رہی تھی "

"تو پھر کیا ہوا ۔ ماں نے بتایا تھا کہ تم میری بھابی ہو "

"کاکا ـــــ مجھ پر بہت کچھ گزر چکا ہے ۔ دروازوں پر تالے پڑ گئے ہیں ۔ اس لیے اب مجھے یہاں سے چلے جانا ہے ۔ اس گھر میں میری یہ آخری رات ہے ۔ میں تجھ سے مل کر جانا چاہتی تھی ـــــ تو کسی کو بتائے گا تو نہیں ؟"

"میں نہیں بتاؤں گا ـــــ بھابی مینا ـــــ لیکن تم کیوں جا رہی ہو ؟ نہ جاؤ ـــــ میں بڑا ہو جاؤں گا ـــــ میرا بیاہ ہو گا ـــــ میں اپنی بیوی کو تمہارے گھر بھیجوں گا ـــــ وہ تمہیں دعوت

دے گی۔ تم اُس سے ملنے کے لیے آنا۔ پھر کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم نہ جاؤ۔"

"لیکن کاکا — تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ تیرا بیاہ دُور ہے۔ اِس قید خانہ میں اتنے دن کیسے کاٹے جائیں گے جبکہ میرا تیری طرف دیکھنا بھی بند کر دیا گیا ہے۔"

"تم جہاں جاؤ گی میں وہاں تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔"

"نہیں کاکا — جہاں میں جا رہی ہوں وہاں کوئی مرد مجھ سے بات نہیں کر سکے گا۔"

"تم وہاں نہ جاؤ۔"

"میرے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ گیا۔ میں نے "پوُجنی" بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"پوجنی، کیا ہوتی ہے؟"

"بھابڑوں کی سادھو عورتیں جن کا سر مونڈ دیا جاتا ہے۔ جن کے مُنہ پر پٹّی ہوتی ہے اور جو ننگے پاؤں رہتی ہیں۔"

"نہیں بھابی مینا —— تم یہ نہ بننا — مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں پر پٹّیاں کچھ اور ہی دکھائی دیتی ہیں۔"

"کاکا — میرے لیے کوئی اور چارہ نہیں۔" اور اُس نے ایک گیند جیسی چیز کھڑکی میں سے بیٹھک کے اندر پھینکی "میری یہ نشانی اپنے پاس رکھنا۔ صبح ڈھونڈ لینا۔ آہٹ پا کر کہیں کوئی جاگ نہ پڑے۔"

اور مینا کی کھڑکی بند ہو گئی۔ کاکے نے تالے میں چابی گھومتی ہوئی سنی۔ وہ رات بھر سو نہ سکا۔

دوسرے دن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو اس کی ماں نے اُسے بتایا کہ مینا بہت دکھی تھی ساس روز لڑتی اور طعنے دیتی تھی۔ وہ تنگ آ کر گھر سے نکل گئی ہے اور یہ لکھ کر چھوڑ گئی ہے کہ وہ پجارن بننے کے لیے جا رہی ہے۔

"لیکن ماں کیا وہ یہاں پجارن نہیں بن سکتی تھی؟"

"نہیں جو عورت پجارن بننا چاہتی ہے وہ اپنا شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کے آشرم میں جا کر رہنے لگتی ہے۔ وہ لوگ بڑی پوچھ گچھ اور پڑتال کرتے ہیں اور جب ان کو اُس کی نیّت اور ارادے کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ اس کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔ اچھا کھلاتے پلاتے ہیں، اچھے کپڑے پہناتے ہیں اور چند روز تک اُسے من مانی کرنے دیتے ہیں اور پھر وہ اُسے پجارن بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نہ اچھا کھا سکتی ہے۔ نہ اچھا پہن سکتی ہے اور نہ وہ مردوں کے ساتھ بات کر سکتی ہے۔"

"بھابی مینا کہاں گئی ہوگی ؟"

"پتہ چل جائے گا۔"

"اگر وہ کوئی آس پاس کا شہر ہوا تو کیا تم مجھے دکھلاؤ گی ماں ؟"

"گاؤں میں ان کا بہت بڑا آشرم ہے۔ وہاں تیری موسی بھی رہتی ہے۔ اگر وہ وہاں ہوئی تو دو دن کے لیے چلے جانا۔ تیری موسی تجھے دکھلائے گی۔ جب کوئی پجاری بنتا ہے تو شہر میں بڑی رونق ہوتی ہے۔"

کاکے نے موسی کو خط لکھ دیا کہ وہ اس بات کا پتہ رکھے۔

دو ہفتوں میں سب کو پتہ چل گیا۔ ساری گلی میں مینا کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بڑی نیک عورت تھی۔ کسی نے اُس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بال کتنے خوب صورت تھے۔ اُنھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اُسے رُنڈ مُنڈ بنا دیا جائے گا۔ انگلیوں سے ایک ایک کر کے تمام بال اُکھاڑ دئے جائیں گے۔ بے چاری!

کاکا موسی کے یہاں پہنچ گیا۔ اُس کی موسی آج مینا کو دیکھ کر آئی تھی۔ اُس نے بہت ہی دلآویز کپڑے پہن رکھے تھے۔ زیور بھی۔ یہ زیور لوگوں نے مستعار دئے تھے۔ گیت گانے والے بلائے گئے تھے۔ وہ چونکہ کاکے کی گلی کی رہنے والی تھی اس لیے موسی کی دل چسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر رسم میں شامل ہوتی تھی۔ وہ کاکے کو بتایا کرتی کہ اُس کے رنگ روپ پر نکھار آ گیا تھا۔ کل اُسے ڈولی میں بٹھا کر شہر میں گھمایا جائیگا اُس پر پھول برسائے جائیں گے۔ گلاب چھڑکا جائے گا۔

کاکا اپنی بھابی کو دیکھنے کے لیے بہت بے قرار تھا۔ اُس نے ہمیشہ اُسے ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اُن کپڑوں میں بھی بہت خوب صورت معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے زیورات اُسے کیسے پھبتے ہوں گے۔ اُس نے کبھی اُسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی موسی یہ ذکر کیا کرتی تھی کہ اُس کی مسکراہٹ بڑے بڑوں کا دل موہ لیتی تھی۔

اُس کی نشانی یعنی اس کا دیا ہوا رومال کاکے کی اندرونی جیب میں تھا۔ اُس کے بارے میں اُس نے کسی کو کچھ بتایا نہیں تھا۔ لیکن وہ اُسے روز دیکھا کرتا تھا۔ اُس نے ہندی کے حروف سیکھ لیے تھے کیونکہ اُس پر یہ الفاظ کڑھے ہوئے تھے "بڑے پیارے کاکے کو۔ اُس کی بھابی کی طرف سے!"

اُس کی موسی نے اُسے بتایا کہ دوسرے دن دوپہر کے بعد مینا کی ڈولی نکلے گی۔ اس ڈولی کو تمام بازاروں میں گھمایا جائے گا۔ ہر کوئی دیکھ سکے گا۔

کاکے نے دوسرے دن موسی کے باغ میں سے بہت سے پھول توڑ کر رومال میں باندھ لیے۔ جب ڈولی اُن کے چوک کے قریب آئی تو وہ جان بوجھ کر گھر والوں سے الگ ہو گیا۔ وہ ڈولی دیکھ کر لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تمام راستے پر ڈولی کے ساتھ ساتھ رہنا چاہتا تھا۔

باجے والوں نے وردی پہن رکھی تھی۔ جلوس میں شامل جینی ڈولی پر روپوں پیسوں کی بارش کر رہے تھے۔ ڈولی میں اس کی بھابی گہنوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اُس کی صورت کچھ مختلف دکھائی دے رہی تھی لیکن اُس میں پہلی صورت کی جھلک بھی موجود تھی۔ اُس متبسّم صورت کے مقابلہ میں کاکے کو اُس کی افسردہ اور اُداس آنکھیں بہت پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس پجارن پر بے پناہ حسن و شباب اُمڈ آیا تھا۔ لیکن کاکے کو اس کے بناؤ سنگار میں اس کے پیارے پیارے خدوخال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کا دھیان اس کی طرف ہے تو وہ پھول ڈولی کے اوپر پھینک دیتا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ دیتی تھی۔ لیکن وہ ہاتھ اس کے لیے نہیں جوڑتی تھی۔ اُس ہجوم میں چھوٹا سا کاکا اُسے کیونکر دکھائی دے سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

ایک موڑ مڑتے ہوئے ڈولی اچانک اُس کے بہت نزدیک آگئی۔ پھولوں کی بارش ہوئی تو مینا نے ہاتھ جوڑے۔ کاکا اس وقت پھول پھینکنے ہی لگا تھا۔ مینا نے اُسے پہچان لیا۔ اُس کی نیم وا آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس کی ڈولی روک دی جائے۔

"یہ لڑکا ہماری گلی کا ہے — مجھ پر پھول پھینکنا چاہتا ہے۔ لیکن پھول مجھ تک پہنچتے نہیں ہیں اُسے ایک منٹ کے لیے میرے پاس لے آؤ۔"

یہ ایک انوکھا وطیرہ تھا لیکن پجارن بن جانے والی عورت کا کہا ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

"لاؤ — تمہارے یہ پھول میں لے لوں — تم بڑی دُور سے آئے ہو — میری گلی کے کاکا۔"

کاکا بہت خوش ہوا۔ مینا بھابی نے اُسے دیکھ لیا۔ پاس بلایا۔ ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر اُس سے پھول لے لیے۔ رومال بھی نہیں لوٹایا۔ شاید بھابی اپنے پاس اُس کی نشانی رکھنا چاہتی تھی۔

جلوس آشرم پر پہنچ گیا۔ لوگ رخصت ہوئے۔ مینا اور چند عورتیں سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ سیڑھی پر پاؤں رکھنے سے پہلے مینا نے مڑ کر دیکھا۔ کاکا ایک دوکان کے تختے پر کھڑا تھا۔

مینا کو بڑے پجاری کے سامنے بٹھا دیا گیا۔

"کیا تم ارادہ باندھ چکی ہو؟" بڑے پجاری نے پوچھا۔

"جی مہاراج ـــ میں ارادہ باندھ چکی ہوں۔"

"تمہیں یہ کپڑے ـــ اور یہ زیور اُتارنے پڑیں گے ـــ پھر کبھی تم زندگی بھر ان کو پہن نہیں سکو گی۔"

"جی مہاراج ـــ مجھے ان کی کوئی خواہش نہیں۔"

"تمہیں وہی کچھ کھانا اور پہننا ہوگا جو ہمارے اس حلقے کے قاعدے کے مطابق ہوگا۔"

"جی مہاراج ـــ مجھے اچھی خوراک کی ضرورت نہیں۔"

"مردوں کو چھونا تو ایک طرف رہا ان کا خیال تک اس دھرم کو ناپاک کر دے گا جسے تم آج چُن رہی ہو۔"

مینا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کی جیب میں رکھا ہوا کاکے کا رومال اُسے کھلتا ہوا محسوس ہوا اور رومال کے سرے چھوٹے چھوٹے بازو بن کر اس کی کمر کے گرد لپٹ گئے۔ اچانک اس نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"جی مہاراج ـــ مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

"اب تم اس کمرے میں چلی جاؤ۔ یہ کپڑے اُتار دو۔ وہاں جو کپڑے تمہیں پہننے کے لیے دیے جائیں پہن لو۔ اس کے بعد تمہیں اپنے یہ بال کٹوا دینے ہوں گے اور اس کے بعد تمہیں پجارن ماتا یہ بتائیگی کہ کس طرح اُنگلیوں سے یہ بال اُکھاڑے جا سکتے ہیں۔"

بالوں کے کاٹنے اور اُکھاڑنے کی بات سُن کر وہ اپنے ہونٹوں میں دل سے اٹھی ہوئی آہ نہ روک سکی تو بڑی ہمت سے کام لے کر اُس نے کہا۔

"پوجیہ پتا جی ـــ کیا آپ مجھے بال رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بڑے پجاری نے حیران ہو کر کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ میری یہ مانگ انوکھی ہے۔" مینا کے دل میں ایک نامعلوم سی طاقت پیدا ہو رہی تھی۔ "اگر آپ مان جائیں تو میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ معلوم نہیں میرے اندر کیا گرہ بندھی ہوئی ہے۔ میں آپ کی ایسی خادمہ بنوں گی کہ ساری قوم حیران و ششدر رہ جائے گی۔ میرے بال نہ کاٹے جائیں۔"

"یہ بات کبھی ہو نہیں سکتی۔ کیا تمہیں پہلے یہ بات معلوم نہیں تھی؟"

"مجھے معلوم تھی ـــ مَیں نے سوچا تھا کہ میں بال کٹوا لوں گی۔ لیکن اب جبکہ بال کاٹنے کا وقت

آیا ہے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میرے یہ بال زندہ ہیں ـــــ میرے وجود سے اُگے ہیں۔ اِن میں زندگی کا لمس ہے۔ میں نے کئی سال تک ان کے سوا کسی سے بات نہیں کی (اور پھر ماتھا ٹیکتے ہوئے) اے دھرماتما ـــــ! ایک بار ایسا بھی کر دیکھئے۔ آپ اپنے فیصلہ پر کبھی نہیں پچھتائیں گے۔"

بڑے پجاری کا دل پسیج گیا ـــــ وہ سوچنے لگا ـــــ "پجارن کے بال دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟"

"نہیں ـــ تمہاری یہ بات مانی نہیں جا سکتی ہے۔"

"تو پھر مجھے پانچ منٹ کے لیے اپنے دل کو سمجھا لینے دیجئے۔" مینا نے دل کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ـــ جاؤ ـــ سامنے چبوترے پر بیٹھ کر سوچ لو۔"

مینا دھیرے دھیرے اُٹھی مگر دھرتی پر مضبوطی سے پاؤں جماتے ہوئے چبوترے پر جا بیٹھی اس چبوترے سے نیچے بازار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مینا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کوئی نرالی عورت ہے۔ میں نے کئی عورتوں کو پجارن بنانے کی رسم ادا کی ہے۔ لیکن اس کی ہر بات سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر یہ پجارن بن گئی تو بڑی شہرت حاصل کرے گی!" بڑے پجاری نے کہا۔

"لیکن اُٹھ کر کھڑی کیوں ہو گئی؟" دوسرے پجاری نے کہا۔

بڑے پجاری نے اُس طرف دیکھا۔ مینا چبوترے پر کھڑی تھی۔ مینا نے اپنی اُنگلیاں اپنے جُوڑے میں پھیریں۔ اس کا جُوڑا کھُل گیا۔ اس کے بال اُس کی کمر سے نیچے لٹکنے لگے۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوا میں اس کے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں لہرا رہی تھیں۔

"کتنے لمبے ـــــ"

"اوہ ـــــ" سب اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ چبوترے پر کوئی عورت کھڑی نہیں تھی۔

سب نیچے پہنچے۔ بازار میں کہرام بپا تھا۔ ایک لڑکا کچلی اور مسلی مینا کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اُس نے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال ایک طرف ہٹا کر اُس کے بالوں کی مانگ سیدھی کر دی تھی۔ کالے بالوں میں کہیں کہیں لہو سیندور کی طرح چمک رہا تھا۔ لڑکے کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا۔ اور وہ نیچے گری پڑی عورت کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔

کاکے نے اس سے پہلے ان کا رنگ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں اُس کالی رات جیسی تھیں جس آخری رات کو اُس نے آکر اُسے جگایا تھا۔ لیکن اس رات کی گہرائیوں میں سورج نکل آیا تھا۔ جبھی تو وہ رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھی ـــــ وہ آنکھیں اب بھی اُتنی ہی کالی اور اُتنی ہی روشن تھیں ـــــ اور وہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

لیکن اُن میں اس وقت کوئی سورج روشن نہیں تھا۔

سنت سنگھ سیکھوں

پیمی کے بچّے

یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں سات سال کا تھا اور میری بہن گیارہ برس کی تھی۔ ہمارا کھیت گھر سے کوئی ایک میل دور تھا۔ آدھ بیچ جرینلی سڑک گزرتی تھی جس پر جنگلیوں، پٹھانوں، اُچکّوں اور اجنبیوں کی کافی آمد و رفت رہتی تھی۔ ہم سب بچّے جن کو گھر بیٹھے پٹھانوں سے بہت خوف آیا کرتا تھا کسی بڑے آدمی کو ساتھ لیے بغیر اُس سڑک پر سے گزرتے ہوئے ڈر کے مارے کپکپا اُٹھتے تھے۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ ہمیں دن میں دو بار اپنے والد اور کھیت مزدور کے لیے روٹی لے جانی پڑتی تھی اور ہر روز ہماری حالت ایک دشوار گھاٹی سے گزرنے والے لوگوں کی طرح ہوتی تھی۔

ہم عام طور پر گھر سے بڑی ہمّت باندھ کر نکل کھڑے ہوتے تھے لیکن ابھی سڑک پر تین فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کر پاتے تھے کہ نہر کا معاون نالہ پار کرتے ہوئے ہم پر سکتہ طاری ہو جاتا اور ہم کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگتے کہ شاید گاؤں کا کوئی بڑی عمر کا آدمی آتا جاتا نظر آ جائے اور اُس کا سہارا لے کر ہم اُس بھیانک سمندر کو پار کرنے کے قابل ہو جائیں۔

ہمیں مذہبی تعلیم ہی کچھ اس قسم کی مل رہی تھی کہ طرح طرح کے خوف ہمارے مزاج کا ایک حِصّہ بن گئے تھے۔ ہر روز شام کو ہم گھر میں بڑے بوڑھوں سے جنّت اور جہنّم کے افسانے سنا کرتے تھے۔ جنت تو ہمیں کھیت کے سوا کہیں اور میسّر نہ آتی لیکن جہنّم قدم قدم پر ملتا۔ سب سے بڑا جہنّم تو مدرسہ تھا۔ اُس سے اگر کسی دن نجات مل جاتی تو کھیت پر روٹی لے جانے کے جہنّم سے واسطہ پڑتا۔ قصّہ کوتاہ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ جہنّم ہمارے ہر راستہ میں گھات لگائے بیٹھا رہتا تھا۔

نہ جانے اُس سڑک کا سمندر پار کر کے کھیت پر جانا ہمیں جہنّم معلوم ہوتا تھا یا کھیت پر روٹی لے جاتے ہوئے اُس سڑک سے گزرنے کے خیال نے اُسے ایک بھیانک سمندر بنا دیا تھا۔ میں اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ کھیت جنّت تھا، روٹی لے جانے کی

زحمت جہنم تھی اور وہ بیچ کی سڑک بھیانک سمندر تھی۔

سردی کے دن تھے۔ ہم دونوں بہن بھائی دوپہر کا کھانا لے کر کھیت کی طرف چل پڑے۔ بڑی سہانی دھوپ پڑ رہی تھی اور ہم سردی کی اُس دھوپ میں نیند کا سا مزہ لے رہے تھے۔ لیکن سڑک پر سے گزرنے کا ڈر دل کو چوہے کی طرح کتر رہا تھا۔

ہم نے خوف کو دبانے کا ایک عام طریقہ استعمال کرنا چاہا۔ بہن مجھے ایک کہانی سُنانے لگی۔

"ایک تھا راجہ۔ اُس کی رانی مر گئی۔ مرنے سے پہلے اُس نے راجہ سے کہا: "مجھ سے ایک وعدہ کرو۔" راجہ نے پوچھا: "کیسا وعدہ؟"

میں نے کہانی کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر پیچھے مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھا کہ شاید کوئی آدمی ہمارے ہی راستے پر آ رہا ہو۔

"تم سُن نہیں رہے ہو" بہن نے میرا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں — میں نہیں سُنتا" میں نے ایک بھائی جیسی گستاخی سے جواب دیا۔

"وہ رانی جب مرنے لگی تو اُس نے راجہ کو اپنے پاس بُلایا اور کہا: "مجھ سے ایک اقرار کرو۔" راجہ نے پوچھا: "کیسا اقرار؟" رانی نے کہا: "دوسری شادی نہ کرنا۔" اوہ میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ رانی کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی تھی۔"

ہمیں راجہ اور رانی اپنے ماں باپ جیسے دکھائی دئے۔ ہماری ماں مرنے لگے گی تو وہ ہمارے باپ سے یہی قول مانگے گی۔ شاید یہ خیال ہمارے دل میں کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن رانی کی بیٹی معلوم ہوئی اور میں اپنے آپ کو اس کا بیٹا محسوس کرنے لگا۔

میری بہن گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی: "اب آگے بھی تو سُناؤ" میں نے پہلے کی طرح کرخت لہجے میں اُس سے کہا۔

"رانی نے سوچا کہ میرے بیٹوں اور بیٹی کو سوتیلی ماں ستائے گی" بہن نے کچھ زیادہ شیریں اور کچھ زیادہ نسوانیت کا روپ بھرتے ہوئے کہا: "یہی وجہ تھی کہ رانی نے راجہ سے یہ قول مانگا تھا۔ راجہ نے کہا: "اچھی بات ہے میں یہ اقرار کرتا ہوں۔"

جیسے راجہ اگر یہ اقرار نہ کرتا تو رانی مرنے سے انکار کر دیتی۔

"ہونہہ"

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ دن کو کہانی کہی جائے تو راہگیر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں لیکن ہم نے

ایک دوسرے کو اس سے خبردار نہ کیا اور ہم نے اپنے اس علم کو اپنے دل اور اپنے خیالات پر اثر نہ کرنے دیا۔

"ہونہہ"

پچھلے موڑ پر ہمیں ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑے ہو گئے تاکہ وہ ہم سے آملے۔ کہانی بھی رُک گئی۔ وہ آدمی کسی اور سمت میں جا رہا تھا۔ وہ ہماری طرف نہ مُڑا۔ ہم نے جس مقصد کے لیے یہ کہانی چھیڑی تھی وہ پُورا نہ ہوا۔ ہمارا خیال تھا کہ کہانی میں محو ہو کر ہم اچانک سڑک پار کر لیں گے۔ سڑک ایک فرلانگ اور باقی رہ گئی تھی اور ہماری کہانی دم بخود ہو کر رک گئی تھی۔ بڑی عمر کے کسی آدمی کے آملنے کی اُمید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ہم دونوں سہمے ہوئے کھڑے رہے۔ دس بیس قدم اور آگے بڑھے تو ہمارا خوف بھی کچھ اور بڑھ گیا۔ سڑک پر کالی مخمل کی واسکٹ اور پٹھانوں جیسی کھُلے پائینچوں کی شلوار پہنے ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔

"وہ دیکھو۔ کوئی پٹھان سویا پڑا ہے!" میں نے کہا۔

اُس آدمی نے کروٹ بدلی۔

"یہ تو ہل رہا ہے۔ جاگ رہا ہے۔" میری بہن نے خوفزدہ ہو کر کہا "اب کیا کریں؟"

"کیا یہ ہمیں پکڑے گا؟"

"اور نہیں تو کیا۔" اس نے جواب دیا۔

ہم رات کو گھر سے بہت کم باہر نکلا کرتے تھے لیکن ہم نے یہ سُن رکھا تھا کہ اگر ڈر لگے تو 'واہگورو' کا نام لینا چاہیے۔ ڈر جاتا رہتا ہے۔ ہماری ماں ہمارے ماموں کی بات سُنایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ہمارے ماموں اور ایک برہمن رات کو کسی گاؤں کی گلیوں میں سے گزر رہے تھے کہ اُن کے قدموں میں بڑے بڑے انگارے آکر گرنے لگے۔ برہمن نے ہمارے ماموں سے پوچھا "کیا کریں؟" اُس نے کہا "پنڈت جی رام کا نام لو۔" ہمارا ماموں 'واہگورو'، 'واہگورو' کرنے لگا اور پنڈت رام رام۔ انگارے گرتے رہے لیکن اُن سے دُور۔ اس بات کے لیے ہم اپنے ماموں پر بہت نازاں تھے۔

"ہم بھی 'واہگورو'، 'واہگورو' کہیں۔"

"واہگورو سے تو بھوت پریت ڈرتے ہیں آدمی نہیں۔" میری بہن نے کہا۔

میں مان گیا۔ سڑک پر پڑا ہوا پٹھان آدمی تھا۔ وہ خدا سے کیسے ڈر سکتا تھا۔

"تو پھر اب کیا کریں؟"

ہم پانچ سات منٹ تک دم بخود کھڑے رہے۔ ہم اب بھی اپنے دل میں یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ کوئی آدمی اس پٹھان کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہم سے آملے گا۔ لیکن ہماری یہ اُمید پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہے لیکن اُس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں ڈھونڈ ہی کیا سکتے تھے۔

ہماری معصومیت اور ہماری رفاقت بے چین اور مضطرب تھی۔ چند منٹ کے بعد میں رو پڑا۔

میری بہن نے اپنے پلّو سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیوں بھیّا۔ کیوں میرے چاند۔ ہم یہیں کھڑے رہیں گے اور گاؤں سے ابھی کوئی آجائے گا۔"

ہم نے آگے کی طرف چند قدم اُٹھائے۔ اور پھر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد چند قدم پیچھے ہٹ آئے۔

آخر کار میری بہن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ہم کہیں گے کہ ہم پمی کے بچّے ہیں۔ ہمیں نہ پکڑو۔"

اُس کے مُنہ سے جب بھی پمی کا لفظ نکلا کرتا تھا وہ بہت میٹھا ہوا کرتا تھا۔ اور اب جبکہ وہ میری طرف جھک کر مجھے دلاسہ دے رہی تھی تو خود بھی پمی بن گئی تھی۔

میری ڈھارس بندھ گئی۔ پٹھان کو جب یہ پتہ چلے گا کہ ہم پمی کے بچّے ہیں تو وہ ہم سے کچھ نہیں کہے گا — اور ہمیں پکڑ کر بھی نہیں لے جائے گا۔

جس طرح کا پنتا ہوا دل اور ڈگمگاتے ہوئے قدم "واہگورو" "واہگورو" کہتے شمشان بھومی میں سے گزر جاتے ہیں اور جس طرح ہندو گائے کی دُم پکڑ کر دُنیا کے بھیانک سمندر کے پار جا اُترتے ہیں بالکل اسی طرح ہم پمی کا نام لے کر سڑک پار کر گئے۔ پٹھان اسی طرح وہاں پڑا رہا۔

گورمکھ سنگھ مسافر

ناس پیٹے

"دروپدی نے کچی نیند میں کہا ــــ نہیں اُس کے منہ سے نکل گیا "ناس پیٹے" ہارن کی آواز سے اس کے کان جو پھٹنے لگے تھے۔ آج تک ہارن کی جتنی آوازیں اس کے کان میں پڑی تھیں وہ آواز سب سے زیادہ کھُردری تھی "گنیشا ٹیکسی والا نہیں۔ چانن شاہ ہوں گے!" اپنے خاوند بھگت رام کے منہ سے چانن شاہ کا نام سُن کر دروپدی کچھ شرما گئی "ہائے۔ کہیں شاہ جی نے سُن ہی نہ لیا ہو!

تین چار دن پہلے گنیشے کی ٹیکسی کا ہارن سُن کر دروپدی کے منہ سے نکلا تھا "ناس پیٹوں کو خبر نہیں رات کو بھی نیند نہیں آتی" اُس وقت بھگت رام کے سمجھانے پر کہ "اُس غریب ٹیکسی والے کا چالان ہو گیا ہے۔ بے چارا شرنارتھی ہے۔ سفارش کے لیے کہتا ہے" دروپدی نے اور بھی اونچی آواز میں کہا تھا "جائے جہنم میں ناس پیٹا!" گنیشے نے یہ بات سُن لی تھی لیکن غرض مند تھا کیا کہتا؟ آج چانن شاہ کا لحاظ بھگت رام کو دروپدی کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچا گیا۔ موٹر روک کر چانن شاہ بھگت رام کی خواب گاہ میں چلا آیا۔ دروپدی نے "آیئے۔ آیئے" کہہ کر کرسی آگے کھسکا دی۔

چانن شاہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کھڑے کھڑے پوچھا "لالہ جی تیار ہو؟"

"جی ہاں ــــ بس دوا کی شیشی لیلوں۔ نہ جانے واپس آتے ہوئے کتنی دیر ہو جائے ــــ اور ....."

بھگت رام کی بات بیچ میں ٹوکتے ہوئے چانن شاہ نے کہا "نہیں جی ــــ ابھی واپس آجائیں گے ــــ نئی موٹر ہے ــــ ڈھائی گھنٹے میں انبالہ ــــ گھنٹہ بھر وہاں رہیں گے۔ اور ڈھائی گھنٹے میں دلی واپس آجائیں گے۔ کل چھ گھنٹے کی بات ہے۔ اگر دس پندرہ منٹ میں چل پڑیں تو سوا بارہ بجے تک لوٹ آئیں گے"

"نہیں شاہ جی۔ شرنارتھی کیمپ میں میرے کم سے کم سوا دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"چلو۔ زیادہ سے زیادہ تین بجے لوٹ آئیں گے۔ شام سے پہلے۔ اُٹھیے۔ جلدی کیجیے جتنی جلدی چلیں گے اتنی ہی جلدی واپس آجائیں گے۔" دروپدی نے کہا "اگر دیر ہو جانے کا ڈر ہے۔ یا رات وہیں رہنا پڑ جائے تو پھر کوئی بھاری کپڑا یا بستر ...."

چانن شاہ نے دروپدی کو بھی اپنی بات پوری نہ کرنے دی اور بھگت رام کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی پر سے اُٹھالیا۔ "چلیے کسی چیز کے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی لوٹ آئیں گے۔ اگر آپ کو سردی لگتی ہے تو موٹر میں کمبل پڑا ہے۔ اُسے اپنے گرد لپیٹ لینا۔ آپ کو تین بجے ضرور گھر پہنچا دیں گے۔"

بھگت رام نے بڑے اطمینان سے نئی موٹر کے نرم گدے پر آرام کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا "دروپدی جی۔ اگر کوئی شخص کسی کام سے آئے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ تین بجے آئے۔"

چانن شاہ نے بھگت رام کے گھٹنوں پر کمبل پھینکتے ہوئے کہا "بس آپ کو ڈپٹی کمشنر کو اپنی صورت دکھانی ہوگی اور ہمارا کام بن جائے گا۔ اس کے بعد آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں موٹر میں پٹرول بہت ہے۔"

لالہ بھگت رام شرنارتھیوں کے لیڈر ہیں۔ صبح سے شام تک ان کے پاس غرض مند شرنارتھی آتے رہتے ہیں۔ وہ سب کی باتیں ہمدردی سے سُن کر ان کا کام کر دینے کا جتن کرتے ہیں۔ دروپدی کا سبھاؤ ویسے تو بہت میٹھا ہے اور اپنے پہلو میں ہمدرد دل رکھتی ہے لیکن صبح جاگنے سے پہلے اور رات کو سو جانے کے بعد جو آدمی بھی دروازے پر آکھڑا ہوتا ہے وہ اس پر کبھی کبھی بہت خفا ہوتی ہے۔

ابھی موٹر کوارٹر سے باہر نکلی ہی تھی کہ ایک شرنارتھی نے لالہ بھگت رام کے بارے میں آکر پوچھا۔ دروپدی نے بتایا کہ وہ چانن شاہ کے ساتھ انبالہ چلے گئے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

"اُٹھتے ہیں اور سرمایہ داروں کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اگر آج وہ میرے ساتھ کسٹوڈین کے پاس نہ گئے تو شام کو سامان اور برتن سڑک پر ہوں گے۔" وہ ابھی گیا ہی تھا کہ دوسرا آن پہنچا۔

"میرا قرضہ تو منظور کرا دیا ہے۔ قرضہ کیسے لوں۔ ضمانت کون دے گا۔"

"میرے تبادلہ کے کاغذوں پر آج دستخط ہو گئے ہیں۔ مکان رشتہ دار شرنارتھیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہیں۔ بیوی پورے دنوں پر ہے۔ جہاں میرا تبادلہ کیا جا رہا ہے، وہاں رہنے کے لیے خیمے تک کا انتظام نہیں۔"

"میں پشاور میں اے۔ ڈی۔ ایم تھا۔ یہاں کلرکی ملی ہے۔ اس سے بھی جواب کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔"

"بہن جی — ایک سو سات بنگلوں کے مالک کو کسی کوٹھی کے برآمدہ میں بھی ٹھکانا نہ ملے۔ آپ ہی کہیے کہ کہاں جا کر سر چھپائیں۔"

دروپدی آج آنے والے تمام شرنارتھیوں کے یہ کام سُن کر ان کو تین بجے آنے کا وقت دیتی رہی۔ پانی کی نرم اور نازک بوندیں مسلسل ٹپک ٹپک کر پتھر میں بھی اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔ دروپدی کے پہلو میں تو ماں کا دل ہے۔ "شوہر گیا۔ بیٹا گیا۔ اب عزت بھی جاتی دکھائی دے رہی ہے۔" ایک ادھیڑ عمر کی شرنارتھی عورت کے منہ سے یہ بات سُن کر دروپدی اُس سے یہ کہنے لگی تھی کہ وہ تین بجے آئے کہ شرنارتھی عورت نے اپنی داستان چھیڑ دی۔ آنکھوں کی زبان نہیں ہوتی۔ لیکن آنکھیں زبان سے محروم بھی نہیں ہوتیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس شرنارتھی عورت کی دُکھ بھری کہانی اُس کی زبان اور دروپدی کی آنکھوں سے سنائی جا رہی تھی۔ اس بے خیالی اور بے خودی میں دروپدی دوسرے آنے والوں کو تین بجے کا وقت دینا بھول گئی۔ ایک اور عورت جس نے اپنے گورے اور خوب صورت بدن کو چیتھڑے چیتھڑے ہو چکے میلے چیکٹ دوپٹے سے بمشکل ڈھانپ رکھا تھا دروپدی کی طرف آتی دکھائی دی۔ اُس نے اپنے بدن کے اگلے حصّے کو چھپانے کے لیے اپنا سر اس قدر جھکا رکھا تھا کہ وہ آنے جانے والے کسی شخص کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ زمین پر نظریں گاڑے ہوئے جب وہ دروازے پر پہنچی تو اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے ایک شرنارتھی کا سر اس کے پہلو میں لگا اور وہ دھڑام سے گر پڑی۔ اس کے گرنے کی آواز سے دروپدی کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دروپدی نے گرنے والی عورت کو دوسری شرنارتھی عورت کی مدد سے باہر کے کمرے میں بچھی ہوئی میلی اور لوگوں کی جوتیوں کے باعث مٹی سے بھری دری پر لٹا دیا۔ کمرے میں بیٹھے دوسرے لوگوں کو دروپدی نے پونے تین بجے آنے کے لیے کہہ کر اُٹھا دیا۔ گرنے والی عورت کی بے ہوشی دیکھ کر دروپدی کے ہوش گُم ہو گئے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی اور اس کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ پہلی شرنارتھی عورت نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ گھبرائی ہوئی دروپدی نے دروازے کی جھری میں سے باہر جھانکا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں ہارن کی آواز آئی۔ کیا تین بج چکے تھے؟ اوہ — یہ تو گینشا ہے۔ ناس پیٹا! پچھلے الفاظ دروپدی کے مُنہ سے نکل تو گئے لیکن وہ کچھ سوچ میں ڈوب گئی۔ اُس نے اشارے سے گینشے کو بُلا بھی لیا۔ وہ اس سے کوئی کام کہنے کیلئے ہچکچائی لیکن وہ مجبور تھی۔

"قرول باغ گوردوارہ روڈ پر لیڈی ڈاکٹر کرتار کور کا نام پوچھ لینا۔"

گنیشا ساری دلّی سے واقف ہو چکا تھا۔ دروپدی کے مُنہ سے بات سنتے ہی ٹیکسی لے کر ہَوا ہو گیا۔

گنیشے نے فوراً واپس آکر دالان میں داخل ہوتے ہی زور سے ہارن بجایا۔ دروپدی کے کان اُس وقت شرنارتھی عورت کی "ہائے ہائے" اور نومولود بچّے کی چیخیں سننے میں مصروف تھے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر دروپدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس حاملہ عورت کی حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے دروپدی کی تعریف کی۔ "ٹیکسی والے کے چلے جانے کے بعد مجھے خیال آیا۔ میں ٹیلیفون کرا دیتی۔ آپ نے ایک بار اپنا فون نمبر نوٹ کروایا تھا۔" دروپدی کی بات سن کر لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "جی — وہ گھمنڈا سنگھ جی کا نمبر تھا۔ لیکن اب تو وہ سندیسہ ہی نہیں پہنچاتے۔ پیسے والے آدمی ہیں۔ ہاں — اگر ان کے اپنے کسی رشتہ دار یا ملنے جلنے والے کا کام ہو تو فوراً آدمی بھیج دیتے ہیں۔" "ناس پیٹے — پیسے کا اتنا گھمنڈ —"

دروپدی کی ہمدردی پاکر لیڈی ڈاکٹر نے حاملہ شرنارتھی عورت کا اتا پتہ پوچھا — دروپدی نے سارا قصہ سناتے ہوئے کہا، "ہم نے اس کا اتا پتہ ابھی پوچھا ہی نہیں۔ ذرا ٹھیک ہو جائے تو ..."

"یہ بھی اچھا ہوا۔ اگر سڑک پر ہی بے چاری ..."

"اچھا بہن دروپدی — مجھے اپنا دُکھڑا رونے بھی آپ کے یہاں آنا تھا۔ لالہ جی کہاں ہیں؟"

"کیوں — کیا بات ہے — وہ تو انبالہ تک گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔"

"نہیں جی — بات کیا بتاؤں — میں جس گیرج میں کام کرتی ہوں۔ اُسے تو آپ جانتی ہی ہیں۔ میں نے دو ہزار روپے لگا کر پارٹیشن ڈلوائی۔ دن بھر کام کرتی ہوں اور وہیں کوچ پر سو جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جو گیرج میرے پاس ہے اُسے بخشی خوشحال چند ایڈوکیٹ نے اپنے نام الاٹ کروالیا ہے۔"

"ناس پیٹے۔"

"ہاں بہن دروپدی — فکر سے مجھے تو رات بھر نیند نہیں آتی"

تین بج گئے — چار اور پھر پانچ کا وقت ہو گیا۔ لالہ بھگت رام کے کوارٹر کے سامنے شرنارتھیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ ابھی تک انبالہ سے واپس نہیں آئے۔

"چانن شاہ کے گھر ٹیلیفون کر کے پتہ لگاؤ۔" دروپدی کے کہنے پر اس کے چھوٹے بیٹے نے ٹیلیفون ڈائریکٹری دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان کے گھر تو ٹیلیفون ہے ہی نہیں۔"

"نہیں ہے — لالہ جی نے ابھی تو کوشش کر کے لگوا کر دیا ہے۔" دروپدی کی یہ بات سنکر

ایک شرنارتھی نے کہا: "لالہ جی دوڑ دوڑ کر سرمایہ داروں کا ہی کام کرتے ہیں۔"

"ناس پیٹے۔ نقص نکالنے کے لیے آجاتے ہیں۔ سرمایہ کے بغیر کون سا کام چلتا ہے —— چانن شاہ لالہ جی کو اپنی موٹر میں بٹھا کر انبالہ لے گئے ہیں۔ کام اگرچہ ان کا اپنا تھا۔ لیکن لالہ جی کو شرنارتھیوں کی مزاج پرسی کے لیے جانا تھا۔ آرام سے گئے ہیں۔ آرام سے آجائیں گے۔" یہ بات کرتے ہوئے دروپدی نے اپنے بیٹے کو آواز دی: "ٹیلیفون کے پوچھ گچھ دفتر سے چانن شاہ کا نمبر پوچھ لو۔"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"لالہ چانن شاہ کی کوٹھی سے۔"

"شاہ جی انبالہ گئے تھے؟"

"اب آگئے ہیں۔"

"ان کو ذرا ٹیلیفون دیجیے۔"

"آپ تھوڑی دیر میں فون کیجیے گا۔ اِس وقت وہ باہر باغیچے میں بیٹھے ہیں۔ چند مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پارٹی ہو رہی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا تو پتہ کر دیجیے کہ لالہ بھگت رام جوان کے ساتھ گئے تھے کہاں ہیں؟"

"آپ کون بول رہی ہیں؟"

"دروپدی —— لالہ جی کی بیوی۔"

"ایک دو منٹ انتظار کیجیے۔ اپنا نمبر بتا دیجیے۔" دروپدی اپنا نمبر بتا کر تارکور سے باتیں کرنے لگی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو..."

"کہیے۔"

"شاہ جی کہتے ہیں کہ لالہ جی ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی سے ہی تانگہ لے کر شرنارتھی کیمپ چلے گئے تھے۔ موٹر میں پٹرول تھوڑا تھا اور شاہ جی کو اپنے ایک دو کام اور کرنے تھے۔ شاہ جی کو شرنارتھی کیمپ سے لالہ جی کو اپنے ساتھ لانا تھا لیکن دوسرے ضروری کاموں میں بہت زیادہ وقت لگ گیا۔ یہاں گھر پر کچھ آدمیوں کو چائے پر بُلا رکھا تھا۔ اگر وہ کیمپ میں لالہ جی کو لانے کے لیے جاتے تو

ان کو بہت زیادہ دیر ہو جاتی - اس لیے وہ واپس آ گئے۔۔۔۔"

گئے، کا لفظ ابھی کان ہی میں پڑا تھا کہ دروپدی نے " ناس پیٹے " کہہ کر رسیور کریڈل پر دے مارا۔ سب کو بات کا پتہ چل چکا تھا۔ کام والے لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

رات کا سکون جوں جوں گہرا ہوتا جا رہا ہے دروپدی کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ سڑک پر سے گزرتی ہوئی ہر موٹر کی آواز اپنے مکان میں سنتی۔ وہ مغالطے میں دروازہ کھولتی اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی غائب ہو جاتی۔ زچہ شرنارتھی عورت کی دیکھ بھال دروپدی کے لیے جاگنے کا اچھا بہانہ ہے۔ لیکن ویسے بھی آج اس کی آنکھوں میں نیند آتی تو کہاں سے آتی۔

دسمبر کی رات ہے۔ بستر کے بغیر— وہ کوئی بھاری کپڑا ابھی ساتھ نہیں لے گئے۔ دوا کے بغیر اُنھیں نیند نہیں آتی۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ شرنارتھی عورت پر کپڑا ٹھیک کرتے کرتے، موٹروں کی آوازوں پر مڑ مڑ کر باہر جھانکتے جھانکتے اور انگیٹھی میں آگ کی راکھ جھاڑ کر سلگاتے سلگاتے دروپدی کی صبح ہو گئی۔ آخر کار کل کی طرح مُنہ اندھیرے ایک موٹر اس کے دالان میں آ کر رُکی۔ اس کی آواز آج بھی بڑی کھُردری ہے۔ لیکن وہ ہارن دروپدی کے کانوں کو صبح کا راگ معلوم ہوا۔ گنیشے نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ میلے کچیلے کمبل میں لپٹے ہوئے لالہ بھگت رام باہر نکلے۔ دروپدی دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کمبل کی موٹائی کا اندازہ لگا رہی تھی اور لالہ جی کہہ رہے تھے کہ شرنارتھی بے چارا رات سردی کے مارے مر گیا ہو گا۔ اس کے پاس ایک ہی تو کمبل تھا جو اُس نے مجھے ٹرین میں بٹھاتے ہوئے زبردستی میرے گرد لپیٹ دیا۔ دروپدی نے بایاں ہاتھ قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ " ست سری اکال " کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ گنیشے کی اُڑتی ہوئی جاتی ٹیکسی کو دور تک دیکھتے دیکھتے اس کے مُنہ سے نکلا " اِدھر اس غریب کو دیکھو، اور اُدھر اُن ناس پیٹیوں کو "

سُبجان سنگھ

راس لیلا

میں اُس وقت نو دس سال کا ہوں گا۔ جس کوٹھی میں ہم رہتے تھے اس میں تین خاندانوں کے لیے کھُلی جگہ تھی۔ ایک حِصّے میں ہم رہتے تھے اور دوسرے میں امرتسر کے مشہور ٹھیکیدار سردار۔ تیسرا بھی ایک ہندو بیوپاری تھا جس کی عمر میرے آج کے شعور کے مطابق ساٹھ پینسٹھ سال کی تھی۔ وہ میری پیدائش ہی سے وہاں رہتا تھا اور مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ اُس کا اُس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اس نے اپنا بیاہ وہاں کے ایک غریب گھرانے کو پیسے دے کر کیا تھا۔ تین چار مہینے سے میں بوڑھے کا دروازہ ہمیشہ بند دیکھ رہا تھا اگرچہ باہر تالا نہیں پڑا ہوتا تھا اور کنڈی نہیں چڑھی رہتی تھی۔

ایک دن جب میں اسکول سے واپس آیا تو وہ دروازہ کُھلا تھا۔ اور میں اُسے اندر دیکھ کر جوں ہی "بابا۔ بابا" کہتے کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے تیوری چڑھا کر اور مجھے تھپّڑ دکھا کر اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے مجھے باہر جانے کو کہا۔ میں حیران تھا اور "بابے" (بوڑھے) نے بھی حیرت کے آثار میرے چہرے پر ضرور پڑھے ہوں گے۔ میں اُلٹے پاؤں مڑا ہی تھا کہ "بابے" نے مجھے بستے سمیت گود میں اُٹھا لیا اور باہر لا کر ایک اکنّی میری ہتھیلی پر رکھ دی "کرشن — اب مجھے چاچا کہا کرو۔ کہو گے نا؟" اپنے سوال کا جواب میرے اثبات میں سر ہلانے سے پا کر اُس نے بڑے پیار سے مجھے نیچے اُتار دیا۔

گھر پہنچتے ہی ماں نے مجھے دودھ کا گلاس دیا اور کہا کہ وہ ابھی ایک چھوٹا سا پراٹھا پکائے دیتی ہے۔ اتنے میں بابے کی نوکرانی مجھے بلانے کے لیے آگئی۔ ماں نے کہا "جا بیٹا تیرے تاؤ نے تجھے بلایا ہوگا"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا "کون سا تاؤ — ٹھیکیدار تاؤ" ماں نے جواب دیا "کپڑے والا تاؤ"۔

میں نے کہا "بابا تو کہتا تھا کہ میں تیرا چچا ہوں"۔

ماں ہنس پڑی اور بولی "اوہ — اُسی نے بُلایا ہے۔ یہ اس کی نئی نوکرانی ہے — بیٹا — تیری تائی نے بلایا ہوگا۔"

میں یہ باتیں سُن کر چکرا سا گیا اور پڑا ٹھا واپس آکر کھانے کے خیال سے نوکرانی کے ساتھ چل پڑا۔

میں جب چچا کے دکان میں داخل ہوا تو اُس نے مجھے پہلے کی طرح گود میں اُٹھا لیا اور اُسی طرح مجھے پاس کے کمرے میں لے گیا۔ لوہے کی الماری کے ایک قدِ آدم آئینہ کے سامنے گندمی رنگ کی ایک پتلی دبلی نازک اندام سی عورت اپنے گھٹنوں تک لمبے اور کالے بال سنوار رہی تھی۔ آئینہ میں ہمیں آتا ہوا دیکھ کر اس نے ہماری طرف رُخ کرنے سے پہلے پنجاب کے رواج کے مطابق اپنی ساڑھی کا پلّو اپنے سر پر لے لیا۔ چچا نے کہا "کرشن — تیری چاچی۔"

میں گھر کے آداب کے مطابق چچی کے پاؤں پر ماتھا ٹیکنے کے لیے اُترا تو چچی نے پاؤں پیچھے کھینچ لیے اور مجھے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میرے بازو بمشکل اس کی کمر تک پہنچتے تھے۔ اُس نے میرے سر کے بالوں میں اپنی لمبی لمبی اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "یہ لڑکا کتنا پیارا ہے۔"

"رام پیاری" چچا نے کہا "یہ مجھے بھی بہت پیارا لگتا ہے۔ میں نے اسے اُنگلیوں سے ناپ کر پالا ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے چچی کے گرد سے اپنے بازو ہٹائے تھے تو چچی نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

چچا نے پوچھا "کیوں — کیا بات ہے پیاری؟"

"کچھ نہیں" اس نے پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور مجھ سے بڑے پیار کے ساتھ پوچھا، "تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟"

میرے بتانے پر اس نے غیر پنجابیوں کی طرح دوہرایا "کرشن چندر۔"

بال سنوارے بغیر اُس نے صابن سے ہاتھ دھوئے اور ایک پلیٹ میں بالائی اور چاول ڈال کر مجھے کھانے کے لیے دیے۔ میں نے وہ بڑے مزے سے کھائے اور پراٹھے کا خیال بھول کر کھیلنے کے لیے باہر نکل گیا۔

تین دن بعد کی بات ہے کہ جب میں اسکول سے واپس آرہا تھا تو چچی کے تھوڑے سے کھُلے

دروازے میں سے ایک جانی پہچانی آواز مجھے بُلاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں بستے سمیت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں — میں نے باہر کا دروازہ بند کر دیا اور اُس دن کے کمرے کی طرف بڑھا۔ چچی پھر اُسی طرح بال سنوار رہی تھی۔ اُس نے آئینہ میں مجھے آتا ہوا دیکھ کر اپنا مُنہ میری طرف پھیر دیا۔ لیکن کل کی طرح اُس نے سر پر ساڑھی کا پلّو نہ لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ ہچکچائی اور پھر اُس نے اپنے بازو میری طرف پھیلا دئے۔ میں وہیں کھڑا اُس کے گول اور حسین چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے، بانہیں پھیلا کر جوں ہی آگے بڑھا وہ گھٹنوں کے بل ہو گئی۔ میرے دونوں بازو اس کی کمر کے گرد لپٹ گئے اور اُس نے مجھے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اس دن پہلی بار میں نے نرمی اور ملائمیت کو محسوس کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ چچی نے اپنا دایاں بازو ڈھیلا کر کے میرا گال اپنے بائیں گال سے لگا لیا اور ہم بڑی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت رہے۔ آخر کار اس کے آنسو میرے گال پر بہنے لگے۔ وہ آنسو ٹھنڈے بھی تھے اور نیم گرم بھی۔ میں ہوش میں آ رہا تھا۔ جب مَیں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں آخر کار اس کا دوسرا بازو بھی ڈھیلا پڑ گیا اور اُس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آج کے شعور کے مطابق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سو کر اُٹھنے والی آنکھوں کی طرح بوجھل اور غنودگی آلود تھیں۔ میں نے پوچھنا چاہا "چاچی ....." اُس نے بیچ ہی میں بِلی جُلی بنگلہ اور ہندی زبان میں کہا "کرشن چندر — میرا نام رادھا ہے۔ مجھے رادھا کہہ کر بلایا کرو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے پہلے سوال کو بھولتے ہوئے کہا "چاچا — کہاں ہیں؟"

رادھا نے کہا "وہ دوکان لے کر منگلا ہاٹ گیا ہے۔ اماوس کے سوا اُسے اس وقت کبھی فرصت نہیں ہوتی۔"

"نوکرانی؟" میں نے پوچھا۔

"اُسے نکال دیا ہے —" اس نے جواب دیا۔ "وہ اچھی عورت نہیں تھی اور اب سارا کام میں خود کروں گی۔"

اچانک — نہ جانے اُسے کیا ہوا۔ اُس نے میرے بستے کو جو ابھی تک میرے بائیں پہلو سے لٹک رہا تھا اُتار دیا۔ میرا کوٹ اُتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔ قمیص کھول کر میرے بوٹ اُتار دئے۔

اُس نے میری دائیں ٹانگ کو آگے کی طرف بڑھا کر گھٹنے پر سے جھکا دیا اور پیر کو پنجے کے بل رہنے دیا۔ بائیں ٹانگ ویسی کی ویسی رہنے دی۔ پھر وہ چاروں طرف آنکھوں سے کچھ ٹٹولتی ہوئی دکھائی دی۔ تیزی سے وہ ایک کھونٹی پر سے لکڑی اُتار لائی اور میرے دونوں ہاتھوں میں لمبی کر کے تھما دی۔ اور اس کا ایک سرا میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اور پھر وہ پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اُس نے ایک لمبی "ہونہہ" کی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے سنگار میز کی دراز میں سے ایک گلابی اور ریشمی فیتہ نکال لائی اور اُس نے میرے سنہرے بالوں کو پیچھے کی طرف ہٹا کر وہ فیتہ میرے سر پر باندھ دیا اور کان کے نزدیک پھول سا بنا دیا۔ آئینے والی الماری کھول کر اُس نے ایک پیلی بنارسی ساڑھی نکالی۔ اُسے کھولتے کھولتے وہ دوسری دیوار پر ٹنگی ایک تصویر کی طرف گئی جس پر ایک سہرا چڑھا ہوا تھا۔ اُسے بڑے غور سے دیکھتی ہوئی وہ میری طرف مڑی۔ اور اس تصویر کو دیکھتی دیکھتی وہ دھوتی میری کمر سے باندھنے لگی۔ دھوتی باندھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور مستی میں ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی ٹھیکیدار سرداروں کی چھوٹی بیٹی نئے کھلونے کو اپنے بڑے بھائی سے لے کر یوں ہی کیا کرتی تھی — مجھے رادھا اس جیسی معلوم ہوئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے تیزی سے وہ چھڑی چھین کر بستے پر دے ماری۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں کس کر پانچ سات دس بار چکر کاٹ کر کھڑا کر دیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ اس نے میرے گرم گرم محسوس ہوتے ہوئے رخساروں کو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے دبا لیا اور میرا ماتھا اور میرے بال چوم لیے۔

آہستہ آہستہ اُس نے وہ کپڑے اُتار کر اور میرے کپڑے مجھے دوبارہ پہنا کر مجھے پہلے جیسا بنا دیا۔ رسوئی میں سے دودھ کا ایک چاندی کا گلاس اور ایک چھوٹی سی چاندی کی تھالی میں انگور لا کر اُس نے میرے آگے رکھ دئے۔ اور میں پہلے کی طرح اپنے والدین کے حکم کے خلاف سب کچھ کھا پی گیا۔ اُس نے غسلخانہ میں میرے ہاتھ اور میرا منہ دُھلوایا۔ میں برف جیسے سفید تولیے سے منہ صاف کر کے باہر نکلا۔ رادھا میرے پیچھے تھی۔ وہ سرداروں کی لڑکی کی طرح یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ کل بھی کھیلنے آنا تو میں تمہیں ایک سندر ناچ ناچ کر دکھاؤں گی۔

دروازے کے باہر مینہ برس رہا تھا۔ تیز ہوا ناریل کے پیڑوں کو دوہرا کر رہی تھی۔ میں بھیگتا ہوا موڑ مڑ کر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ماں گھبرائی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے پیار سے اپنی آغوش میں کھینچتے ہوئے اُس نے ظاہری غصّے سے پوچھا "اتنی دیر تک تم کہاں رہے؟"

میں نے والدین اور کتابوں کی تعلیم کے خلاف پہلی بار جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا۔
"اَونِندر کے گھر تھا۔ وہ نیا مشینی لٹو لایا ہے ماں۔"
ماں مطمئن ہو گئی۔
دوسرے دن اسکول میں میرا جی بالکل نہ لگا۔ بڑی مشکل سے چھٹی کی گھنٹی بجی۔ بپن خود بخود چلنے والی موٹر بستے میں ڈال کر لایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم سڑک کے کنارے پٹڑی پر اُسے چلا چلا کر کھیلیں لیکن آج میں نے اُسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ میں رادھا سے کھیلنا چاہتا تھا اور وہ ناچ دیکھنا چاہتا تھا۔
میں نے گھر جا کر دودھ نہ پینے کا بہانہ بنایا۔ اَونِندر کے گھر کھیلنے کا جھوٹ بول کر میں رادھا کے گھر میں داخل ہوا۔ رادھا پہلے ہی کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کبھی کسی عورت کو اتنی خوب صورت ساڑھی میں اور ایسے بناؤ سنگار میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنی انگلی تھما کر رسوئی میں لے گئی۔ مجھے ایک آسن پر بٹھا کر خود نیچے بیٹھ گئی۔ سامنے رکھے برتنوں میں دودھ، بالائی، چاول اور روٹیاں اور ترکاریاں تھیں مکھن بھی تھا۔ میرے انکار کی پروا نہ کرتے ہوئے اُس نے چمچوں سے اور نوالے بنا بنا کر مجھے کھلانا شروع کر دیا۔ میرا پیٹ جلدی بھر گیا۔ رادھا نے غسلخانہ میں میرا منہ ہاتھ دُھلایا۔
ہم ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ اگربتی سے مہکا ہوا تھا۔ سنگار میز پر ایک چاندی کی تھالی میں سہرے، پھول اور گھی کے اَن جلے دیئے پڑے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے چابیوں کے گچھے والے پلّو سے ایک چابی چُن کر کپڑوں کی الماری کھولی گئی۔ رادھا نے اس میں سے ایک پیلی ریشمی دھوتی نکال کر پلنگ پر رکھ دی۔ ایک کھونٹی سے مور کے پنکھوں کا ایک مکٹ لاتے ہوئے کہا۔
"کرشن چندر۔ یہ میں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے بنایا ہے۔"
میں ابھی تک حیران کھڑا تھا۔ رادھا سنگار میز کی دراز میں سے ایک بانسری نکال لائی۔ دس منٹ کے اندر دھوتی، مکٹ، سہرے اور بانسری کے ساتھ مجھے آراستہ کر دیا گیا اور پھر مجھے کل کی طرح کھڑا کر دیا گیا۔ ایک سہرا سامنے کی تصویر پر ڈالا گیا۔ جب میں نے اپنا چہرہ سامنے کے آئینے میں دیکھا تو میں ہو بہو سامنے کی تصویر جیسا لگ رہا تھا۔
میں نے پوچھا: "وہ کس کی صورت ہے؟"
اُس نے مسکراتے ہوئے کہا: "کیا تمہیں خبر ہی نہیں — کرشن چندر کی۔"
"میری؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ کرشن چندر کی"

دیا سلائی جلا کر تھالی میں پڑے ہوئے پانچوں دیے جلائے گئے اور رادھا اس تھالی کو دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے آ گئی ۔ اُس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر دونوں آنکھیں بند کر لیں ۔ آنکھیں کھول کر اُس نے تھالی کے ایک گوشے میں گھولے ہوئے کیسر اور چاولوں کا ایک تلک اپنی چھنگلیا کے پاس والی اُنگلی سے میرے ماتھے پر لگا دیا ۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھا ۔ میں نے بھی اپنی اُسی انگلی سے کیسر لگا کر اس کے ماتھے کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ اُس نے ماتھا جھکا دیا ۔ میری اُنگلی لگتے ہی وہ کانپ اُٹھی ۔ دِیوں کی لویں کانپ اُٹھیں ۔ لوبان کا دھواں لرز اُٹھا اور گھنگروؤں جیسی چھنکتی آواز نہ جانے کیسے اس کے پیروں میں کانپ اُٹھی ۔ ایک دم وہ اپنی جگہ سے ہلی اور وہ اس طرح آگے بڑھی جیسے پھسل کر گرنے لگی ہو لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گئی ۔ آہستہ آہستہ اس کے پھسلنے اور سنبھلنے کی چال تیز ہوتی چلی گئی ۔ میں سمجھ گیا کہ ناچ شروع ہو چکا ہے ۔ جب وہ اپنی کمر کو بل دے کر جھکاتی تھی تو اس کے لمبے بال فرش کو چھونے لگتے تھے ۔ گھنگروؤں کی چھنا چھن سے کمرے میں ایک ہم آہنگی سی پیدا ہو گئی ۔ چال اور بھی تیز ہو گئی ۔ وہ میرے اردگرد چکر کاٹنے لگی ۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے ۔ مجھے اپنے گرد بہت سی رادھائیں دکھائی دینے لگیں ۔ مجھ جیسے کئی لڑکے میری موجودہ پوشاک میں ان کے آس پاس تھے ۔ اپنے آپ پر میرا قابو کم ہو گیا تھا ۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے میری انگلیاں زبردستی بانسری کے سوراخوں پر رکھ دی تھیں ۔ میں نے بڑے سوراخ کو چھوڑ کر نچلے سوراخ پر ہونٹ رکھ دیے اور پھونک ماری ۔ میری چھوٹی چھوٹی انگلیاں نہ جانے کب ان سوراخوں پہ ناچنے لگیں ۔ میں نے کبھی بانسری نہیں بجائی تھی اور اب بھی میں کوئی ساز نہیں بجا سکتا ہوں لیکن اس دن جیسی بانسری میں کبھی کسی استاد سے بھی نہیں سُن پایا ۔

آہستہ آہستہ میری انگلیاں ڈھیلی پڑنے لگیں ۔ ناچ کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی ۔ رادھا صرف ایک رہ گئی ۔ میں خود بھی ایک رہ گیا ۔ کمرے میں قبر جیسی خاموشی چھا گئی ۔ رادھا شرابیوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھی ۔ لیکن وہ دِیوں والی تھالی ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہی تھی ۔ میں اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھا ۔ میں نے تھالی اس کے ہاتھ سے لے کر سنگار میز پر رکھی ہی تھی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی ۔ میں نے بانسری میز پر پھینک دی اور اُسے سنبھالنے کے لیے بڑھا ۔ نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آ گئی تھی میں ہر حالت میں اپنے آپ کو مکمل مرد سمجھ رہا تھا ۔ میں نے اپنی دھوتی کے پلّو سے پنکھا کیا اور اسے ہوش میں لایا ۔ اُس نے اُٹھ کر میرا رخسار چُوم لیا ۔ میری رگوں میں ایک جُھرجُھری سی دوڑ گئی ۔ میں نے نیم بے ہوشی کی

حالت میں اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ بھی ایک لمحہ کے لیے کانپی اور پھر اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور پھر بے حس ہو کر اُس نے اپنے آپ کو میری آغوش میں گرا دیا۔ میں نے اُس کے رُخسار چُومے۔ اُس کے ہونٹ چومے۔ آنکھیں چُومیں۔ بال چُومے — مگر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنی نیم بیہوش آنکھیں کھول دیں اور فوراً بند کر لیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کوئی آواز نہ آئی — میں پھر بہلا کرشن بن گیا۔ کافی دیر ہو چکی تھی جب میں اپنے گھر پہنچا۔

۲

ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اُس نے بتایا کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔

"اِسے بھوک کیوں نہیں لگتی؟" میرے والد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ہاضمہ تو درست ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

اسکول کے امتحان کی رپورٹ اچھی تھی لیکن اس کے باوجود میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ میں روز رادھا کے یہاں جاتا تھا۔ اس بات پر کبھی کسی کو شک ہی نہیں ہوا تھا۔ لیکن میری ماں جسے میرے رات کے کھانا نہ کھانے کی بڑی فکر ہو رہی تھی خفیہ پولیس کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ایک دن جب میں رادھا کے یہاں گیا تو اس نے دبے پاؤں میرا تعاقب کیا۔ دروازہ بند تھا اس لیے وہ اندر نہ آ سکی۔ لیکن باہر دروازے کے پاس نہ جانے وہ کتنی دیر تک کھڑی رہی ہو گی۔ ناچ ختم ہو جانے کے بعد اُس کی بلند آواز سُنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی "رام پیاری — رام پیاری! رام پیاری!!"

میں تو ڈر گیا۔ لیکن رادھا نے وہ کپڑے جلدی سے اُتار دیے اور مجھے میرے کپڑے پہنا دیے۔ مُنہ ہاتھ بھی دُھلایا۔ اور مجھے پھر اسی کمرے میں چھپا کر وہ باہر نکلی اور اُس نے دروازہ کھول کر میری ماں سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔

ماں نے قہر آلود آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "کرشن کہاں ہے؟"

رادھا نے کہا "یہیں کہیں ہو گا۔"

"مَیں نے اپنی آنکھوں سے اُسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔" ماں نے کڑک کر کہا۔

"میں اندر دیکھتی ہوں۔" رادھا نے بڑے اطمینان سے کہا "میرے سوئے پڑے کئی بار اندر کا دروازہ بند کر کے اکیلا کھیلتا رہتا ہے۔"

اندر آکر اُس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ میں ڈر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رادھا نے دھیمی آواز میں کہا "میرے کرشن — ڈرو نہیں — ہم نے کوئی چوری نہیں کی کوئی پاپ نہیں کیا۔"

میں ہمت کر کے اس کے ساتھ باہر آگیا۔ اُس نے میرا بازو میری ماں کو جا کر تھما دیا اور کہا۔ "یہ لو اپنا مکھن چور — اندر کے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔"

میری ماں مجھے چھوڑ کر مکان میں داخل ہوگئی۔ برابر کے کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں اور دئے روشن دیکھ کر اُس نے بلند آواز میں "اوہ — یہ — یہ —" کہا اور ایک مشکوک نظر ڈال کر تمکنت کے ساتھ واپس آگئی — آتے ہی مجھ پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ رادھا مجھے بچانے کے لیے باہر آئی لیکن پھر واپس ہوگئی۔ وہ دوبارہ آئی اور پھر واپس چلی گئی۔ میرے رخسار پر طمانچہ پڑتے ہی وہ اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔

۳

مجھے کمرے میں بند کر دیا گیا اور میری ماں میرے والد کا انتظار کرتی رہی۔ میں جان بوجھ کر خراٹے لینے لگا۔ میری ماں نے بڑے پیار سے میرے والد کو کھانا کھلایا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر تک برآمدے میں ٹہلنے کے بعد جب وہ اپنے پلنگ پر آکر لیٹ گئے تو ماں بھی باقی کام ختم کرنے کے بعد اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ماں نے آہستہ سے کہا "کیا آپ جاگ رہے ہیں؟"

میرے والد نے کروٹ بدل کر کہا "ہاں۔"

"مجھے ایک بات کرنی ہے۔" ماں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے بات بہت ہی ضروری ہو۔

"کیا بات ہے؟"

ماں نے جو کچھ دیکھا سُنا تھا سب کچھ بتا دیا اور آخر میں کہا "میرے جگر کے ٹکڑے کو اندرے جا کر بنگالن نہ جانے کیا جادو ٹونا کرتی رہتی ہے۔"

والد نے جواب دیا "کیوں پاگل ہوئی جاتی ہو۔"

ماں کے زور دینے پر والد نے کہا "اچھا کل صبح اُس بوڑھے سے ملوں گا۔"

۴

تیسرے دن جب میں اسکول سے لوٹا تو میں اپنے گھر جانے کے بجائے رادھا کے گھر کی طرف

مڑ گیا۔ دروازہ پوری طرح کھلا تھا۔ اندر کوئی سامان نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے غور سے دیکھا۔ اب بھی اندر کوئی سامان نہیں تھا۔ میں ساتھ والے کمرے میں گیا۔ اُس میں بھی کوئی نہیں تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن کا کوئی انگ کاٹ لیا گیا ہے۔ میں بستے سمیت کمرے کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں پاتال میں اُتر رہا تھا۔ اچانک کسی نے آکر میرا بازو پکڑ لیا۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ رادھا ہو گی۔ لیکن کسی نے بازو بہت زور سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ماں ــــ میں رو رہا تھا۔ ماں مجھے گھسیٹ کر واپس لے جا رہی تھی۔

کرتار سنگھ دوگل

کرامات

"....اور پھر بابا نانک چلتے چلتے حسن ابدال کے جنگل میں جا نکلے۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی — چلچلاتی دھوپ — جیسے کوّے کی آنکھ نکلی پڑ رہی ہو — چاروں طرف سنسان پتھر ہی پتھر۔ ریت ہی ریت۔ جُھلسی ہوئی جھاڑیاں، سوکھے ہوئے درخت۔ دُور دُور تک کوئی آدمی کوئی آدم زاد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔"

"اور پھر آماں —" میں نے حامی بھری۔

"بابا نانک اپنے خیالوں میں مست چلے جا رہے تھے کہ مردانے کو پیاس لگی۔ لیکن وہاں پانی کہاں "مردانے — صبر سے کام لے۔ اگلے گاؤں جا کر جتنا تیرا جی چاہے پی لینا۔" لیکن مردانے کو تو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ بابا نانک یہ سُن کر بہت فکر مند ہوئے۔ اس جنگل میں تو پانی دور دور تک نہیں تھا۔ لیکن جب مردانا ضد پر آجاتا تھا تو سب کے لیے مصیبت کھڑی کر دیتا تھا۔ بابا نانک نے پھر سمجھایا۔" مردانے یہاں پانی کہیں بھی نہیں ہے۔ صبر سے کام لے۔ خدا کی مرضی کے آگے سر جُھکا دے۔" لیکن مردانہ تو وہیں بیٹھ گیا۔ اس سے ایک قدم اور آگے نہیں چلا جاتا تھا۔ بابا بہت زِچ ہو گئے۔ گرو نانک مردانے کی ضد دیکھ کر مُسکراتے اور حیران ہوتے۔ آخر کار جب بابا نانک نے مردانے کو کسی طرح راہ پر نہ آتے دیکھا تو وہ اپنے آپ میں کھو گئے۔ جب گرو نانک کی آنکھیں کھُلیں تو وہ کہنے لگے۔" بھائی مردانے — اس پہاڑی پر ایک کُٹیا ہے۔ جس میں ولی قندھاری نام کا ایک درویش رہتا ہے۔ اگر تو اس کے پاس جائے تو تجھے پانی مل سکتا ہے۔ اس علاقے میں صرف اس کا کنواں پانی سے بھرا ہوا ہے۔ پانی اور کہیں بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر آماں —" میں یہ جاننے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا کہ مردانے کو پانی مِلتا ہے کہ نہیں۔

"مردانے کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ سنتے ہی پہاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔ چلچلاتی دوپہر اور

اور اُس پر پیاس اور اس پر بھی پہاڑ کا سفر۔ مردانہ ہانپتا کانپتا پسینے میں شرابور بڑی مشکل سے پہاڑ پر پہنچا۔ اُس نے ولی قندھاری کو سلام کیا اور پانی کے لیے التجا کی۔ ولی قندھاری نے کنوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ کنوئیں کی طرف بڑھا تو ولی قندھاری کے دل میں ایک خیال آیا اور اُس نے مردانہ سے پوچھا "اے نیک انسان۔ تو کہاں سے آیا ہے؟" مردانے نے کہا "میں نانک پیر کا ساتھی ہوں۔ ہم چلتے چلتے ادھر آ نکلے ہیں۔ مجھے سخت پیاس لگی ہے اور نیچے کہیں پانی نہیں۔" بابا نانک کا نام سُن کر ولی قندھاری جلال میں آ گیا اور اُس نے مردانے کو ویسا کا ویسا اپنی کٹیا میں سے باہر نکال دیا۔ تھکے ہارے مردانہ نے بابا نانک کے پاس آ کر فریاد کی۔ بابا نانک نے سارا قصہ سنا اور مسکرا دئے۔ "مردانے تو ایک بار پھر پہاڑ پر جا۔" بابا نانک نے مشورہ دیا۔ "اس دفعہ تو انکسار سے بھرا دل لے کر جا۔۔۔ وہاں جا کر کہنا میں نانک درویش کا ساتھی ہوں۔" مردانے کو سخت پیاس لگی تھی۔ پانی اور کہیں تھا نہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ جھنجھلاتا اور بلبلاتا ہوا پھر پہاڑ کی طرف چل پڑا۔ پانی اُسے ولی قندھاری نے پھر بھی نہ دیا۔ "میں ایک کافر کے ساتھی کو چلّو بھر پانی نہیں دوں گا۔" ولی قندھاری نے ایک بار پھر مردانے کو ویسے کا ویسا واپس بھیج دیا۔ اس دفعہ جب مردانہ نیچے آیا تو اُس کا بُرا حال تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ اُس کے چہرے سے پسینے کے دھارے چھوٹ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مردانہ کوئی دم کا مہمان ہے۔ بابا نانک نے سارا قصہ سُنا اور "دھن نرنکار" کہہ کر مردانے کو ایک بار پھر ولی قندھاری کے پاس جانے کو کہا۔ مردانہ حکم کیسے ٹالتا۔ پھر چل پڑا۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ اس کی جان راستے ہی میں نکل جائے گی۔ مردانہ تیسری بار پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر ولی قندھاری کے قدموں میں جا گرا۔ لیکن قہر و غضب کی آگ میں جلتے ہوئے فقیر نے اس دفعہ بھی اس کی التجا کو ٹھکرا دیا۔ "نانک اگر اپنے آپ کو پیر کہتا ہے تو کیا وہ اپنے مرید کو ایک گھونٹ پانی نہیں پلا سکتا؟" ولی قندھاری نے طعنے دئے۔ مردانہ اس دفعہ جب نیچے پہنچا تو پیاس سے بلبلاتے ہوئے وہ بابا نانک کے قدموں پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ گرو نانک نے مردانے کی کمر پر ہاتھ پھیرا اس کی ڈھارس بندھائی اور مردانے نے آنکھیں کھول دیں۔ بابا نانک نے اُسے سامنے کا ایک پتھر اکھاڑنے کے لیے کہا۔ مردانہ نے پتھر اکھاڑا تو اس کے نیچے سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ پانی کی ایک نہر بہنے لگی اور دیکھتے دیکھتے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ اتنے میں ولی قندھاری کو پانی کی ضرورت پڑی۔ اُس نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو اس میں پانی کی ایک بوند نہیں تھی۔ ولی قندھاری حیرت زدہ رہ گیا۔ پہاڑی کے دامن میں پانی کے دھارے بہہ رہے تھے۔ چشمے پھوٹ رہے تھے۔ دور بہت دور ببول کے پیڑ کے نیچے ولی قندھاری نے دیکھا کہ بابا نانک اور ان کا ساتھی دونوں

بیٹھے تھے۔ غصّہ میں آکر ولی قندھاری نے چٹان کا ایک ٹکڑا اپنے پیر کا زور لگا کر لڑھکا دیا۔ ایک پوری پہاڑی کو اپنی طرف لڑھکتے ہوئے دیکھ کر مردانہ چلّایا۔ بابا نانک نے بڑے اطمینان سے "دھن نرنکار" کہنے کو کہا اور جب پہاڑ کا ایک ٹکڑہ بابے کے سر کے نزدیک آیا تو گرو نانک نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے پنجے سے روک لیا اور حسن ابدال میں اب اس کا نام "پنجہ صاحب" ہے۔ آج تک پہاڑ کے اس ٹکڑے پر بابا نانک کا پنجہ ثبت ہے۔"

مجھے یہ قصہ بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن جب میں نے ایک ہاتھ سے پہاڑی کو روکنے کی بات سُنی تو میرے مُنہ کا ذائقہ پھیکا پڑ گیا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کوئی آدمی پہاڑ کو کیونکر روک سکتا ہے؟ اور پہاڑ پر ابھی تک بابا نانک کا پنجہ ثبت ہے۔ مجھے ذرا بھی اعتبار نہ آیا۔ "کسی نے بعد میں کندہ کر دیا ہوگا۔" اور میں اپنی ماں سے بحث کرتا رہا۔ میں یہ تو مان سکتا ہوں کہ پتھر کے نیچے سے پانی پھوٹ سکتا ہے۔ سائنس نے بہت طریقے ایجاد کئے ہیں جن کے ذریعہ اُس جگہ کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جہاں پانی ہوتا ہے۔ لیکن ایک انسان کا لڑھکتی ہوئی پہاڑی کو روک لینا۔ میں یہ بات نہیں مان سکتا تھا۔ میں یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا اور میری ماں میرے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

"کوئی لڑھکتی ہوئی پہاڑی کیسے روک سکتا ہے؟" مجھے جب اس قصّہ کا خیال آتا تو میں پھیکی سی ہنسی ہنس دیا کرتا۔

کئی بار گوردوارے میں یہ قصہ سُنایا گیا۔ لیکن پہاڑی کو پنجے سے روکنے والی بات پر ہمیشہ میں سر ہلا دیا کرتا۔ میں اس بات کو مان نہیں سکتا تھا۔

ایک دفعہ یہ قصّہ ہمیں اسکول میں سُنایا گیا۔ پہاڑی کو پنجے سے روکنے والے حصّے پر میں اپنے اُستاد سے اُلجھ پڑا۔

"کرنی والے لوگوں کے لیے کوئی بات مشکل نہیں ہوتی۔" ہمارے استاد نے کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن مجھے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ "آخر پہاڑی کو کوئی کیونکر روک سکتا ہے؟" میرا جی چاہتا تھا کہ میں زور زور سے چیخوں۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ہم نے سُنا کہ پنجہ صاحب میں "ساکا" ہو رہا ہے۔ اُن دنوں "ساکے" بہت ہوا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی "ساکا" ہوتا میں سمجھ جاتا کہ آج ہمارے گھر کھانا نہیں پکے گا۔ اور رات کو فرش پر سونا پڑے گا۔ لیکن یہ "ساکا" ہوتا کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔

ہمارا گاؤں "پنجہ صاحب" سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ جب اس "ساکے" کی خبر آئی تو میری ماں

پنجہ صاحب کی جانب چل پڑی۔ ماں کے ساتھ میں تھا اور میری چھوٹی بہن تھی۔ پنجہ صاحب تک راستہ بھر میری ماں نے اپنی آنکھ نہ کھولی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یہ "سا کا" کیا ہوتا ہے۔

ہم جب پنجہ صاحب پہنچے تو ہم نے ایک عجیب کہانی سنی۔

دُور کسی شہر میں انگریزوں نے نہتے لوگوں پر گولی چلا کر اُنھیں ہلاک کر دیا۔ مرے والوں میں نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی — جو لوگ زندہ بچ رہے تھے ان کو گاڑی میں کسی دوسرے شہر کی جیل میں لے جایا جا رہا تھا۔ قیدی بھوکے تھے۔ پیاسے تھے۔ اور حکم یہ دیا گیا تھا کہ گاڑی کو راستے میں کسی جگہ نہ روکا جائے۔ جب "پنجہ صاحب" میں یہ خبر پہنچی اور لوگوں نے سنی تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پنجہ صاحب جہاں بابا نانک نے مردانے کی پیاس بجھائی تھی وہاں سے پیاسوں سے بھری گاڑی یوں ہی گزر جائے۔ بھوکوں سے بھری گاڑی یوں ہی گزر جائے۔ مظلوموں سے بھری گاڑی گزر جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاڑی کو روکا جائے گا۔ اسٹیشن ماسٹر کو درخواست ارسال کی گئی۔ ٹیلیفون کیا گیا۔ تار دئے گئے لیکن انگریز کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔ گاڑی راستے میں کہیں بھی نہیں روکی جائے گی۔ اور گاڑی میں شمعِ آزادی کے پروانے اور سرفروش اور محبانِ وطن ہندوستانی بھوکے تھے۔ اُن کے لیے پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ گاڑی کو پنجہ صاحب نہیں رُکنا تھا۔ لیکن پنجہ صاحب کے لوگوں کا یہ فیصلہ اٹل تھا کہ گاڑی کو ضرور روکنا ہے اور شہر کے باشندوں نے اسٹیشن پر روٹیوں، کھیر اور پُوریوں کے انبار لگا دئے تھے۔

لیکن گاڑی تو ایک آندھی کی طرح آئے گی اور طوفان کی طرح گزر جائے گی۔ اُسے روکا جائے تو کیسے روکا جائے؟

اور میری ماں کی سہیلی نے مجھے بتایا کہ: پٹڑی پر وہ لیٹ گئے۔ میرے بچوں کے باپ۔ پھر ان کے کچھ اور ساتھی لیٹ گئے۔ اس کے بعد ان کی بیویاں لیٹ گئیں۔ اور پھر ہمارے بچے۔ گاڑی آئی —— چیختی ہوئی۔ سیٹیاں دیتی ہوئی۔ ابھی دُور ہی تھی کہ اُس کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ لیکن آخر وہ ریل گاڑی تھی۔ رُکتے رُکتے ہی رک سکتی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی۔ ریل کے پہیے ان کی چھاتی پر چڑھ گئے اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو میرے سر کے پاس ریل گاڑی کھڑی تھی۔ میرے قریب ہی دھڑکتی ہوئی چھاتیوں سے "دھن نرنکار" "دھن نرنکار" کی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر میرے دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی مڑی اور پہیوں کے نیچے آ جانے والی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں:

"میں نے اپنی آنکھوں سے خون کی بہتی ہوئی ندی دیکھی اور یہ ندی بہتے بہتے ایک پکے پُل تک چلی گئی تھی۔"

میں ہکّا بکّا اور حیران و ششدر رہا۔ میری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ دن بھر میں پانی کا ایک گھونٹ نہ پی سکا۔

شام کو جب ہم واپس آ رہے تھے تو میری ماں نے راستے میں میری چھوٹی بہن کو "پنجہ صاحب" کا قصہ سُنانا شروع کر دیا۔ کیسے بابا نانک مردانے کے ساتھ اس طرف آئے۔ کیسے مردانے کو پیاس لگی۔ ولی قندھاری نے کیسے اُسے لوٹا دیا۔ کیسے بابا نانک نے مردانے کو ایک پتھر اُکھاڑنے کے لیے کہا۔ کیسے پتھر کے نیچے پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ اور ولی قندھاری کے کنوئیں کا پانی نیچے نیچے کھینچ لیا گیا۔ اور پھر کیسے غضب آلود ہو کر ولی قندھاری نے پہاڑ کا ایک ٹکڑا گرایا۔ کیسے مردانہ گھبرا گیا۔ لیکن بابا نانک نے "دھن نرنکار" کہہ کر اپنے ہاتھ سے پہاڑ کے ٹکڑے کو روک لیا۔

"لیکن کوئی پہاڑ کو کیسے روک سکتا ہے؟" میری چھوٹی بہن نے فوراً ماں کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں روک سکتا۔" میں بیچ میں بول اُٹھا۔ "آندھی کی طرح آتی ہوئی ٹرین کو اگر روکا جا سکتا ہے تو پہاڑ کے ٹکڑے کو کیوں نہیں روکا جا سکتا؟"

اور پھر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ کرنی والے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر نہ رُکنے والی گاڑی کو روک لیا تھا اور اپنے بھوکے پیاسے ہموطنوں کو کھانا کھلایا تھا اور پانی پلایا تھا۔

عقابی

دیوندر ستیارتھی

دسوندھا سنگھ

دسوندھا سنگھ اُس راستے سے آگاہ تھا۔ بانہال سے دس میل آگے کی چڑھائی پر آنے والے موڑ کا ذکر وہ اپنے کلینر سے پٹھانکوٹ ہی سے چھیڑ دیا کرتا۔ سڑک کا وہ خربوزے کی پھانک کی طرح ٹکڑا بہت ہی بدنام تھا۔ برفباری کے موسم میں وہاں کچھ ایسی ہوا چلتی تھی کہ برف پہاڑی کی بلندی سے پھسلنے لگتی اور سڑک مسدود ہو جاتی۔ ان دنوں سرکاری طور پر برف ہٹانے کا کام جاری رہتا تاکہ ٹریفک جام نہ ہونے پائے۔

آج موسم صاف تھا۔ بٹوت میں رات بسر کرنے کے بعد دسوندھا سنگھ اسٹیرنگ وہیل پکڑ کر بیٹھ گیا اور اُس نے کہا "واہ — واہ — آج تو گھبرانے کی ضرورت نہیں بچہ" اور پھر اُس نے اپنے کلینر کو ہاتھ بھر لمبی گالی دے کر نہ جانے کس کس جانور سے اُس کا رشتہ جوڑ دیا اور پھر ارداس (پاٹھ) کے لہجے میں بولا "واہگورو — سچے پادشاہ — تیرا ہی سہارا"۔

گاڑی میں تین مسافر تھے۔ بہت سا سامان لادا جا چکا تھا۔ دسوندھا سنگھ نے سامنے کے آئینے میں دیکھ کر کہا "آپ لوگ — واہگورو سچے پادشاہ کے صرف ڈھائی ٹوٹر ہو۔ دو مرد ایک عورت"۔

سواریوں میں سے ایک مرد نے کہا "سردار جی عورت کو آدھی سواری گن رہے ہو؟"۔

"پھر تو ٹکٹ بھی آدھا ہونا چاہیئے"۔ عورت بلبل کی طرح چہکی۔

بانہال کے گیٹ پر گاڑیاں رُک گئیں۔ گیٹ کھلنے میں بیس منٹ تھے۔

دسوندھا سنگھ نے کہا "بیس گاڑیاں ہم سے آگے ہیں اور پانچ پیچھے ہیں۔ کُل چھبیس ہوئیں۔ یا ایک ساتھ مریں گے یا پار اُتر جائیں گے۔ موسم تو بُرا نہیں"۔

اور پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اپنی بات صرف تو ہی جانتا ہے واہگورو جی۔

ایک دن تو ٹکٹ کٹانا ہی پڑے گا۔ ہم تو وہاں بھی تیرے ڈرائیور بنیں گے۔"

"اُدھر ہم کلینری نہیں کرے گا اُستاد!" کلینر نے ٹوکا۔

"چپ رہ آلو بخارے ــ" دسوندھا سنگھ نے زبان کی فصاحت اور بلاغت دکھائی۔

"اُستاد ــ یہ کلینری کب تک کراؤ گے؟" کلینر نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہلے مڑ کر سواریوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نظریں دسوندھا سنگھ پر جما دیں۔

"چپ رہ ــ جانی چور کے کچھرے (جانگیے)" دسوندھا سنگھ نے اُس کی گت بنائی۔ "ابھی تجھے آیا ہی کیا ہے۔ ہینڈل مارا ــ باتیں بنائیں من من بھر کی۔"

"جانی چور کے کچھرے کا کیا مطلب ہوتا ہے سردار جی" عورت نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

دسوندھا سنگھ نے سامنے کے آئینہ میں دیکھ کر اُس پتلی دبلی لڑکی کے لمبوترے چہرے پر بڑی بڑی آنکھوں کا حساب لگاتے ہوئے کہا "دسویں پادشاہ (گرو گوبند سنگھ) کہہ گئے بی بی ــ پانچ چیزیں اپناؤ۔ کڑا، کیس (بال)، کنگھا، کرپان ــ یہ ہوئیں چار۔ پانچویں کچھرا (جانگیہ)، ایک دفعہ شیطان گلی میں برف ہٹاتے ہوئے اس کا کچھرا گم ہو گیا تھا۔ ہم نے اسے اپنا کچھرا جو ہم نے جموں سے سلوایا تھا نکال کے دیا۔ اُس دن سے واہگورو کی قسم یہ ہمارا جانی چور اپنی تنخواہ میں سے کبھی کچھرا نہیں سِلاتا۔ اور جب کچھرے کے چیتھڑے لٹکنے لگتے ہیں تو پھر اُستاد ہی نہیں چاچا کہہ کر ہاتھ جوڑتا ہے۔"

پتلی دُبلی لڑکی نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا "کیا ہی اچھا ہو اگر ہم سردار جی کو بھی اپنے کسی ڈرامہ میں پارٹ دیں۔"

"ہمیں ڈرامہ میں پارٹ بعد میں دینا ــ" دسوندھا سنگھ نے گیٹ کھلنے کی خبر سن کر کہا "سچے پادشاہ ــ شیطان گلی سے بچانا۔ بچ گئے تو ڈرامہ میں پارٹ بھی کر لیں گے۔"

اگلی گاڑیاں تیزی سے گیٹ پار کر رہی تھیں۔ دسوندھا سنگھ نے بھی گیٹ پار کیا۔ پتھریلی سڑک پر چلتے چلتے پہاڑ کی بلندی کی طرف دیکھ کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے دونوں کان چھو کر کہا۔ "ست نام سری واہگورو ــ اکال پرکھ تیرا ہی آسرا۔" اور دوبارہ کان چھو کر گاڑی چلاتے ہوئے بولا "سچے پادشاہ تیرا ہی سہارا ــ پانچ تنت (عناصر) کا پتلا بنایا۔ کوئی ڈرائیور ہے۔ کوئی کلینر ــ کوئی ڈرامہ کا ایکٹر بھی ہے۔" اور پھر اُس نے پتلی دُبلی لڑکی کے چہرے کی لمبوتری ٹھوڑی کے تل پر اپنی پلکیں بچھاتے ہوئے کہا "بی بی ــ کیا تم ڈرامہ کرتی ہو؟ تمہیں کون سا پارٹ ملتا ہے؟"

پتلی دُبلی لڑکی کے ایک ساتھی نے سردار جی کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری گُل ہما ہیروئن سے کم تو کوئی پارٹ کرتی ہی نہیں۔"

گُل ہما بولی "سردار جی یہ ہمارے ڈائریکٹر ہیں۔ اور یہ ان کی نوازش ہے کہ مجھے ہیروئن بنا لیتے ہیں۔ ویسے سیٹھ جی کو بھی میرا کام پسند ہے۔"

ڈائریکٹر نے مرغ کی طرح اپنی گردن تان کر کہا "گُل ہما تو پیدا ہی ہیروئن بننے کے لیے ہوئی ہے۔ یہ بات سیٹھ جی کئی بار کہہ چکے ہیں۔ آخر یہ اُن کی دولت کا ہی سارا کھیل ہے۔"

تیسرے ساتھی نے بڑی نرمی سے کہا "گُل ہما کے مکالمے مجھے ہی لکھنے پڑتے ہیں سردار جی۔"

"اچھا — اچھا تو آپ ڈرامہ لکھتے ہیں۔" سردار جی نے تیزی سے گاڑی کا اسٹیرنگ گھماتے ہوئے کہا "واہ واہ — سچے بادشاہ — ہمارے دسویں بادشاہ نے بھی "بچتر ناٹک" لکھا تھا۔ باپو جی کہا کرتے تھے کہ دسویں گرو نے عورت کے تمام چرتر کھول کر دکھائے ہیں۔ ایک دن ہماری دادی نے پوچھا "بیٹا — کیا مجھ میں بھی عورت جیسے چرتر ہیں" باپو جی بولے — "تم ہماری ماں ہو۔ اس لیے دو چار کم ہوں گے یا دو چار زیادہ —" اور پھر دسوندھا سنگھ نے پہاڑ کی بلندی کا خیال کرتے ہوئے کہا "اب شیطان گلی دور نہیں۔ ہمارے ڈھائی ٹوٹروں کی ذمہ داری تجھ پر ہے سچے بادشاہ — آج شیطان گلی کے ناٹک میں سے صحیح وسلامت نکال کر لے چل۔ برف سے کیسی دوستی — واہ — واہ — ہماری دوستی تو آگ سے ہے۔ جو پانچ تنت کے پتلے کی ماں بھی ہے اور اسے کھا جانے والی بھی ہے۔"

سڑک کے کنارے ایک جگہ دسوندھا سنگھ نے گاڑی روک لی۔

جو گاڑیاں پیچھے تھیں وہ آگے نکل گئیں۔

"کیوں — رُک کیوں گئے سردار جی —" گُل ہما نے حیران ہو کر پوچھا۔

دسوندھا سنگھ نے گاڑی سے باہر نکل کر کہا "ابے او جانی چور کے کچھرے — باہر آ کر دیکھ۔ ہوا کی نبض کیا کہہ رہی ہے؟"

جانی چور باہر نکلا تو کھڑکی میں پھنس کر اُس کی پگڑی سڑک پر جا گری۔ اُس نے بالوں کا جُوڑا دوبارہ باندھا اور چتکبری پگڑی کس کر سر پہ باندھتے ہوئے کہا "ہوا کیا کہتی ہے اُستاد؟ تیرا یہ وہم خدا ہی دور کرے گا۔"

گُل ہما بولی "مہیش جی ہمارے اگلے ڈرامہ میں ایک دو مکالمے جانی چور کے بھی آنے چاہئیں" اور پھر اُس نے ڈائریکٹر کی طرف آنکھیں گھما کر کہا "اختر صاحب — کمال ہو جائے اگر ہمارے اگلے ڈرامہ میں

جانی چور صابن کی جھاگ کی طرح اُٹھے اور ایک لمحہ کے لیے اپنا رنگ دکھا کر بیٹھ جائے۔ بس مزہ ہی آ جائے۔"

"میں تو سردار جی کے لیے ایک اچھا رول سوچ رہا تھا۔" اختر کی آواز بلند ہوتی گئی اور پھر اُس نے گاڑی کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے آواز کو ایک خاص تال پر لا کر کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے گُل ہما۔" ہدایت کاری کرتے ہوئے اسے کئی آوازیں بدلنے کی مشق ہو چکی تھی۔

"یہ مہیش جی سے پوچھیے۔ مکالموں کے مالک یہ ہیں۔" گُل ہما کے ہونٹوں پر تبسم آیا جیسے گیت کے بول میں کوئی نئی تشبیہہ لہرا جائے۔

"میں تو مکالمہ فٹ کر رہا تھا گل ہما۔" مہیش نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تیری ماں تجھے چنار کے سوکھے پتّوں کے ڈھیر میں سے اُٹھا لائی تھی۔ مزہ آ جائے اگر اسٹیج پر تم یہ بات اپنے مُنہ سے ادا کر دو۔"

اختر نے کہا۔ "کیا سب بچے یُوں ہی ملا کرتے ہیں! کوئی چنار کے سوکھے پتوں کے ڈھیر میں سے اور کوئی چارے کے کمرے میں؟ شکنتلا بھی کنو رشی کو جنگل کے ایک گوشہ میں لپٹی ہوئی ملی تھی۔"

جانی چور بولا۔ "یہ سب تیرا وہم ہے اُستاد۔ سڑک پر کہیں برف کا نام و نشان نہیں۔ ہوا ٹھیک چل رہی ہے۔ اب تک تو ہم سرنگ پار کر چکے ہوتے۔"

"جانی چور ٹھیک کہہ رہا ہے سردار جی۔" گُل ہما نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھیں مٹکائیں۔ "اب چلنا چاہیئے۔ ہمارا ایڈوانس سکوید سری نگر میں ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"بی بی — تم نہیں جانتیں۔" دسوندھا سنگھ نے اپنے ہاتھوں سے دونوں کان چھو کر کہا — "ہوا میں سے آواز آ رہی ہے۔ جیسے کوئی "جپ جی" کا پاٹھ کر رہا ہو۔ پچھلے سال اسی جگہ پر میرا دوست ڈرائیور اجیت برف میں دب کر مر گیا تھا۔ تین تولے سونے کے جھمکے بنوا کر لایا تھا۔ اُسی دن اُس کی سورنا کا جنم دن تھا۔ اجیت "جپ جی" کا پاٹھ کرتے ہوئے مرا تھا۔ کیا تم اجیت کی آواز نہیں سُن رہے؟"

"میں یہ سب باتیں اپنے ڈرامہ میں فٹ کر سکتا ہوں۔" مہیش نے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

جانی چور اور اختر سردار جی پر زور ڈال رہے تھے کہ گاڑی چلانی چاہیئے۔

"ڈھائی ٹوٹرو — تالیاں بجاؤ۔" دسوندھا سنگھ نے ضد چھوڑتے ہوئے کہا اور گاڑی کو آگے لے چلا۔

گل ہما نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "سردار جی آنکھ جھپکتے ہی شیطان گلی پار کر جائیں گے"۔
شیطان گلی کے وسطی نقطہ پر پہنچ کر گل ہما چلائی "سردار جی۔ گاڑی روک لو"۔
گاڑی رُکتے ہی گل ہما باہر نکل کر بولی "پہاڑ کا یہ منظر بھی خوب ہے۔ آئندہ ہم سیٹھ جی کو بھی ساتھ لائیں گے"۔
اختر بولا "ایک آرٹسٹ بھی ہونا چاہیے جو پردے پر اس منظر کو اُبھار سکے"۔
دیکھتے دیکھتے پہاڑ کی چٹان سے برف کے تودے گرنے لگے۔ دسوندھا سنگھ نے گھبرا کر کہا۔ "موسم خراب ہو گیا۔ ہوا شرارت پر اُتر آئی ہے۔ آج خیر نہیں۔ سچے بادشاہ — تیری رضا میٹھی لگتی ہے۔ آج تو برف کے نیچے ہی بستر لگے گا" اور وہ گاڑی چلانے کی بیکار کوشش کرنے لگا۔ جانی چور ہینڈل مار رہا تھا۔
دسوندھا سنگھ گاڑی پر تھپتیوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا "سالی تیرے کباڑ خانہ جانے کے ن آگئے ہیں۔ تیرے نزلے اور زکام کا علاج ہمارے پاس تو ہے نہیں"۔
جانی چور بیلچے سے برف ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دسوندھا سنگھ کہہ رہا تھا "اب کیا کیا جائے بی بی۔ اگر انجن کا کوئی پرزہ ٹوٹ جاتا تو قسم واہگورو کی اپنا دانت نکال کر وہاں فٹ کر دیتا۔ اگر ٹائر پھٹ جاتا تو ٹائر کے بغیر ہی گاڑی سرنگ کے مُنہ پر لے جاتا" اور پھر اس نے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "سچے بادشاہ — تو نے تو برف سے انجن ہی کو ٹھنڈا کر دیا"۔
گل ہما بولی "میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میری موت پہاڑ کی کسی تلہٹی پر ہو۔ اور اپنے کچھ لمحے میرے پاس ہوں — اختر — وہ گھڑی آپہنچی ہے"۔
دسوندھا سنگھ نیچے اُتر آیا اور جانی چور کو گلے لگا کر بولا "جانی — تو میری جان ہے — وہ سامنے موت کھڑی ہے بیٹا"۔
مہیش نے دسوندھا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے — وہ بولا "دیکھ رہی ہو گل ہما؟ لیکن مجھے تو موت کو گلے لگانے کا ذرا سا بھی غم نہیں ہو گا۔ میری ہیروئن میرے ساتھ جا رہی ہے"۔
"مہیش کبھی تو سنبھل کر بات کیا کرو" اختر نے نصیحت کے پردے کے پیچھے حسد کی آگ چھپاتے ہوئے کہا "کچھ تو سوچو کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے"۔
دسوندھا سنگھ کہے جا رہا تھا "سچے بادشاہ — میرا ڈرامہ پورا ہو لینے دو — پھر چاہے پردہ گرا دینا"۔

مہیش بولا "سردار جی۔ تم ہی ہمارے ڈرامہ کے ہیرو ہو"

دسوندھا سنگھ اُداس صورت بنا کر بولا "داڑھی والا بھی کیا کبھی ہیرو ہوا ہے — یارو — یہ حسرت ہی رہ گئی" اور پھر وہ حیران ہو کے بولا "یہ کیا — یہاں بھی اجیت کے "جپ جی" پڑھنے کی آواز آنے لگی"

مہیش نے سردار جی کی بات ان سُنی کرتے ہوئے کہا "گُل ہما — کیا گاڑی کے پہیوں کے جام ہو جانے پر تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی جم کر رہ جائے گی؟"

اختر بولا "ہمارے مرنے کے بعد یہاں سے گزرنے والوں کو ہمارے مکالمے سُنائی دیا کریں گے۔ اس لیے سنبھل کر مکالمے فٹ کر دو بیٹا"

"جینے کو ملے تو مرنا کون چاہتا ہے" مہیش بولا "کیوں گُل ہما"

دسوندھا سنگھ کہے جا رہا تھا "ابے جانی — پڑھ لے تھوڑا سا جپ جی — سُدھار لے اپنی عاقبت" اور پھر اُس نے سامنے کی طرف دیکھ کر کہا "واہ گورو جی — بندہ بھول جاتا ہے — ہم سے تیرا جپ جی نہیں پڑھا جاتا"

جانی چور اب بھی بیلچہ لیے ہوئے برف پر دانت پیستا ہوا ٹوٹ پڑا تھا اُس نے بلند آواز میں کہا "ایک ہماری بات بھی سُن لو استاد — آگ میں جل کر مرنے سے برف کے نیچے دب کر مرنا بہت اچھا ہے"

گُل ہما نے مہیش کی طرف دیکھ کر کہا "یہ مکالمہ بھی نوٹ کر لو"

"اِسے کہتے ہیں ڈرامہ" اختر نے فلسفہ بگھارتے ہوئے کہا "چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو یہ موت اچھی ہے — کیوں گُل ہما۔ تمہارا نام نوش لب کیسا رہتا؟"

دسوندھا سنگھ کہہ رہا تھا "اجیت — جپ جی کا پاٹھ بند کر دے۔ ہمیں گل ہما کی باتیں سُننے دے"

اختر بولا "میری بیوی اور بچی کا کیا ہوگا؟ یہ شیطان گلی — یہ طوفانی شام — یہ گل ہما جس کا نام نوش لب ہونا چاہیے تھا"

"کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم ریہرسل کے لیے بیٹھے ہیں۔ جب مجھے ڈائریکٹر کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے" گل ہما کا قہقہہ طنز کی حدیں چھُو گیا۔

مہیش بھی خاموش نہ رہ سکا "گل ہما! نہ میری بیوی ہے اور نہ کوئی اولاد ہے — میں تو مرنے کے

بعد بھی یہی کہوں گا کہ شیکسپیئر کی طرح کوئی ہملیٹ نہ لکھ سکا۔"

گل ہما بولی "سردار جی ہیرو ہیں۔ بہت بڑے ہیرو۔ جن سے زندگی نے بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ جن کو ہیرو بننا چاہیے وہ بی کلاس بس کے ڈرائیور ہیں اور جو ڈرائیور بھی نہیں اور کلینر ہیں وہ ہیرو بنے بیٹھے ہیں۔ یہ دُنیا بھی عجیب مقام ہے۔"

ہوا کے ساتھ ساتھ نہ جانے اتنی دُھند کہاں سے چلی آئی تھی۔ راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور پھر آہستہ آہستہ برف پڑنے لگی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ڈھائی ٹونٹروں کی طرح دسوندھا سنگھ اور جانی چور بھی بس میں دبک کر بیٹھ جائیں۔

اختر کچھ ایسا خاموش ہوا کہ گل ہما کے بار بار بُلانے پر بھی راضی نہ ہوا۔ وہ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

مہیش نے گل ہما کے اور نزدیک ہو کر کہا "زندگی اور موت کے درمیان چند ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا۔ شام کے اندھیرے ڈھل گئے۔ گلابو گجری کیوں یاد آرہی ہے؟ وہ موے حلوائی کو دودھ دینے آیا کرتی تھی۔ اور میں اپنے مکالمے فٹ کرنے کے لیے ایک پاؤ دودھ کے لیے موے کی دوکان پر کھڑا رہتا تھا۔ اُس دن اور آج کے درمیان دس سال کی خلیج ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے گل ہما کہ تمہارے تبسم میں گلابو کے سانسوں کی مہک رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔ گلابو جہاں کھڑی ہو جاتی میلہ لگ جاتا۔ مجھے یاد ہے گل ہما تم نے ایک دفعہ کہا تھا "مہیش! میں آگ ہوں آگ۔ جو بھی میرے نزدیک آئے گا بھسم ہو جائے گا۔ اور آج میں اس آگ میں بھسم ہو جانا چاہتا ہوں۔"

گل ہما نے ہنستے ہوئے کہا "نام ہے گل ہما۔ جس کا مطلب ہے۔ برف کا پھول۔ لیکن میں نے سچ مچ اپنے سینے میں ایک آگ چھپا رکھی ہے۔"

مہیش نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ برف کا مقابلہ آگ ہی کر سکتی ہے؟"

باہر برف پڑ رہی تھی۔ دسوندھا سنگھ اور جانی چور کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اختر بھی سگریٹ بجھائے بیٹھا تھا۔

مہیش بولا "گل ہما۔ تم نے میرے ساتھ فلم "وار اینڈ پیس" (جنگ اور امن) دیکھتے ہوئے کہا تھا "تم پیئر سے کتنے ملتے جلتے ہو مہیش۔ کاش تم پیئر کی طرح لمبے بھی ہوتے اور تمہاری آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک بھی ہوتی۔"

"اب اگر اس طوفان سے بچ گئے تو میں اپنی آنکھوں پر ایک عینک بھی چڑھا لوں گا۔ اب رہا

سوال لمبے ہونے کا۔ میں ایک اونچے پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر اپنی نتاشا سے باتیں کر لیا کروں گا۔"

گل ہما ہنس پڑی جیسے بانسری کا گیت سم سے پنچم تک اُٹھ جائے۔

باہر برف گر رہی تھی۔ دسوندھا سنگھ خاموشی کا راستہ چھوڑ کر کبھی کبھی "اکال پرکھ" کو بھی پکار لیتا تھا۔

اختر نے بالآخر ایک نیا سگریٹ سُلگایا اور لمبے کش لگانے کے بعد بجھا کر رکھ لیا۔

دسوندھا سنگھ نے اعلان کیا — اپنے اپنے دیوی دیوتا اور پیر و مرشد کو یاد کرو یارو — موت سے مڈبھیڑ ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔"

گل ہما بولی "تم تو ہمارے ہیرو ہو۔"

مہیش نے گل ہما کے نزدیک جھک کر کہا "تمہاری آواز میں لوچ کے ساتھ ساتھ جو تیکھا پن ہے میں اُسے کہاں سے لاؤں۔"

"کلچرل ڈیلیگیشن کے ساتھ سمندر پار جاتے ہوئے مجھے اپنے پیار کا زرتار رومال نہ دے کر جانا۔ میں تو پیار کے تحفے کو بھی سری نگر کے لال چوک میں کھڑا ہو کر گولڈ فلیک کی ایک ڈبیہ کے لیے بیچ سکتا ہوں۔"

گل ہما نے سنجیدہ ہو کر کہا "سری نگر کے لال چوک میں کسی کا لال رومال کون بیچتا ہے۔ ایک رومال کی آرزو میں تو شاید ساری زندگی تڑپتا رہا ہے۔"

مہیش نے گولڈ فلیک کی ڈبیہ میں سے آخری سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا "میں شاید اتنا اچھا آدمی نہیں ہوں جتنا دکھائی دیتا ہوں گل ہما! میں نے زندگی میں تیرہ بار عشق کیا ہے۔ جب تم سمندر پار جاؤ اور ہنسو اور قہقہے تقسیم کرو تو مجھے بھی یاد کر لیا کرنا۔"

دسوندھا سنگھ نے یادکی گاڑی پیچھے کی طرف گھماتے ہوئے کہا "تمہارے موے شاہ کو بات نہیں کرنی آتی ہوگی۔ سچے پادشاہ — واہگورو جی نے گلابو گجری کو ضرور برف کا پھول بنایا ہوگا۔ دیکھئے صاحب عشق کی گلی تو آگ کی گلی ہے۔ ہم نے بھی کبھی کسی سے پیار کیا تھا اور اُسی کی یاد میں ان راہوں پر گاڑی چلا رہے ہیں۔ اور اے سچے پادشاہ اب ہمارا عشق "کگر سنگھی" (شراب) سے ہو گیا ہے۔ ہم یہ شغل ضرور کر لیتے ہیں۔ "کگر سنگھی" آگ ہے اور برف میں آگ کی ضرورت رہتی ہے۔"

اور پھر جیسے یاد کے الاؤ میں اُس نے سوکھی لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا "وہ بھی اس سڑک پر ملی تھی گلو کی جان! اس کا نام تھا لالہ رُخ۔ جیسے وہ بٹوت کے ڈاک بنگلہ میں آرام کرسی پر بیٹھی بیٹھی

باتیں کر رہی ہو۔"

گل ہما بولی "ہم سب اپنا اپنا ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔"

"اور ایک دوسرے کے کرداروں کے ساتھ ہنس سکتے ہیں، رو سکتے ہیں۔" مہیش نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن ایک ڈرامہ کی ہیروئن کو سردار جی دوسرے ڈرامہ کی ہیروئن سے ملا رہے ہیں۔" اختر خاموش نہ رہ سکا "واہ سردار جی — تمہاری کیا بات ہے۔"

دسوندھا سنگھ نے دیکھا کہ پہاڑ پر سے جتنی برف ڈھلک سکتی تھی ڈھلک چکی تھی۔ برف گرنی بند ہو چکی تھی۔ اچانک تلہٹی کی طرف سے ایک روشنی سی نظر آئی۔ اس نے اپنے منجمد ہاتھوں کو جھٹکاتے ہوئے اور اپنے حلق کا پورا زور لگا کر کہا "آگ — آگ — ہم بچ گئے — گلو کی جان — مبارک ہو — مبارک ہو۔"

اس نے باہر نکل کر دیکھا۔ برف گرنی بند ہو چکی تھی اور دھند بھی کم ہو گئی تھی۔ برف پر کھڑے کھڑے وہ گنگنانے لگا۔

"کڑیے بنگال دئے (اے بنگال کی دوشیزہ!)
نی دکھ تینوں کیہڑی گل دا (تجھے دکھ کس بات کا ہے؟)

پھر وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا "اے او بلبل کی لال ٹین — لیڈی اور جینٹلمین — جان بچ گئی گلفامو۔"

اب ڈھائی ٹوٹرو گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ گل ہما ہنستے ہوئے بولی "سردار جی — ذرا اپنے مکالمے دوہرایئے۔"

دسوندھا سنگھ نے مسرت سے شرابور آواز میں کہا "اے کچی کوار گندل! گلو کی جان — بلبل کی لال ٹین — ذرا آگ کے پاس تو پہنچ جائیں۔ پھر وہ باتیں سناؤں گا۔ وہ گھنگرو بجاؤں گا کہ تمہارے یہ ڈائریکٹر اور یہ ڈرامہ نویس مٹی کے مادھو نہ بن جائیں تو نام بدل دینا — گلو کی جان!"

گل ہما کی ہنسی رو کے سے رک نہیں رہی تھی۔

اختر نے سگریٹ سلگایا اور کش لگا کر مہیش کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "مجھے انکریمنٹ مل جائے گی۔"

جانی نے بیلچہ اٹھایا اور سڑک چھوڑ کر پہاڑ کی تلہٹی پر راستہ بنانے لگا۔ کسی پتھر پر پاؤں پڑ جانے سے وہ کچھ ایسا پھسلا کہ دو ہاتھ آگے جا کر گھٹنوں تک برف میں دھنس گیا۔ وہ بڑی مشکل

سے سنبھلا۔ اختر اور مہیش تین چار ڈبے اُٹھا کر جانی کے پیچھے چل پڑے۔ مشکل تھی تو گل ہما کے لیے۔ آگ جتنی نزدیک تھی۔ راستہ اُتنا ہی دشوار تھا۔

دسوندھا سنگھ نے "ککّر سنگھی" (شراب کی بوتل) اپنی انٹی میں دبالی اور پھر گل ہما سے کہا۔ "پرہیزی روٹیاں کھانے والے تمہیں کیسے اُٹھا سکتے ہیں۔ گلو کی جان۔ واہگرو کی قسم۔ تمہیں اُٹھا کر لے چلنے کا کام تو تندوری روٹیاں کھانے والا ہی کر سکتا ہے۔ ڈروگی تو نہیں۔ گلو کی جان"

اب گل ہما دسوندھا سنگھ کی باہوں میں تھی۔ وہ کہتا جا رہا تھا "تمہیں پھول کی طرح وہاں جا کر رکھ دوں گا، او بلبل کی لال ٹین۔ لیڈی اور جنٹلمین"

دونوں کے بدن کی آگ نے نہ جانے کتنی برف پگھلا دی۔

الاؤ والے بوڑھے نے اپنا نام رحیمو بتایا۔ اُس کا کُتّا بھونک بھونک کر آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔

دسوندھا سنگھ سے برف میں گاڑی پھنس جانے کی کہانی سُن کر رحیمو نے کہا "برف سے بچاؤ کے لیے آگ سب کو نصیب ہو" اور ڈبّو نے اپنی لمبی آواز میں جیسے اپنے مالک سے اتفاق کیا۔

دسوندھا سنگھ نے اپنی انٹی میں سے "ککّر سنگھی" نکالی اور جیب سے شیشے کا گلاس۔ اُس نے کہا "چاچا رحیمو۔ یہ ہماری آگ ہے۔ ہم تو پٹیالہ پیگ پئیں گے"

اور اُس نے پیگ پیش کرتے ہوئے کہا "تم ہی پہلے ہماری اس آگ سے منہ لگاؤ۔ گلو کی جان"

اشارہ سمجھ کر چاچا رحیمو چار کٹوریاں اور پانی کا لوٹا اُٹھا لایا۔

پہلا پیگ گل ہما کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ اور پھر سب کو اپنا اپنا پیگ مل گیا۔ چاچا رحیمو اس کے لیے تیار نہ ہوا۔

دسوندھا سنگھ نے "ککّر سنگھی" کے چار گھونٹ پینے کے بعد کہا "چاچا۔ سفید داڑھی والا پیر سفید گھوڑے پر سوار ہو کر ہماری مدد کے لیے کیوں نہ آیا؟ کیا آج کل پیر گھوڑ سواری کے قابل نہیں رہا؟"

چاچا رحیمو نے کہا "سردار جی۔ بہار شروع ہونے پر جب برف پگھلنے لگتی ہے تو پیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ہم لوگوں کو اپنی صورت دکھاتا ہے۔ پھر پیر کا راستہ کھل جاتا ہے۔ لیکن اب تو پیر کی سرنگ بن چکی ہے۔ اور پیر کی سڑک اب بارہ مہینے کھُلی رہتی ہے"

دسوندھا سنگھ نے اپنی کٹوری میں سے دو گھونٹ لیتے ہوئے کہا "چاچا پیر کی مرضی نہ ہوتی تو سرنگ نہ بنتی۔ قسم واہگورو کی" — مسافروں کو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ کر وہ آرام طلب ہو گیا۔ اُس نے گھوڑ سواری چھوڑ دی"۔

جانی نے جھوم کر کہا "پیر کی داڑھی برف جیسی سفید ہو گئی۔ اور جوانی کی طاقت نہ رہی"۔

اختر نے کہا — "پیر بیٹھ گیا اور اُس نے کہا کہ میرے اوپر سے جاتے ہو تو میرے سینے میں چھید ڈال کر گزر جاؤ — پھر کہیں جا کر راستہ ملا"۔

مہیش بھی چپ نہ رہ سکا اور اُس نے کہا — "لوگوں کا خیال تھا کہ پیر کی چھاتی میں چھید ڈالنے سے اتنا پانی نکلے گا کہ وادی ڈوب جائے گی اور دوبارہ ایک جھیل بن جائے گی جیسی اگلے زمانہ میں تھی۔ لیکن ایسی کوئی مصیبت نہ آئی"۔

گل ہما نے مسکراتے ہوئے کہا "میں کہتی ہوں۔ چھوڑو یہ قصہ — سردی کہہ رہی ہے کہ بس آج ہی پڑ کر رہوں گی۔ اور بھوک کہتی ہے کہ آج ہی لگوں گی"۔

"کِکر سنگھی" کے ساتھ اُنھوں نے ڈبوں میں بھرا ہوا کھانے پینے کا سارا سامان ختم کر دیا۔

دسوندھا سنگھ نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا — "جانی — اب تو ڈرائیور بن گیا"

چچا رحیمو الاؤ میں لکڑیاں ڈال رہا تھا۔ دسوندھا سنگھ نے پگڑی اُتار کر گلے میں ڈال لی اور بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے بولا — "میری داڑھی تو ابھی کھچڑی کھا رہی ہے — گلو کی جان! لیکن میرے بالوں پر پیر کی برف پڑ گئی ہے۔ اے لونڈیا — اے چھوری — گلو کی جان — اب تو پیر کی برف اور بھی پڑے گی۔ قسم واہگورو کی — ابھی تو ہمارے بازوؤں میں جان ہے"۔ یہ کہہ اس نے اپنی کٹوری کے آخری دو تین گھونٹ کتے کے منہ میں ڈال دئے۔ اور کتا چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا دسوندھا سنگھ کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

گل ہما ہنستے ہوئے بولی "ابھی ہم کو بہت سے ڈرامے کھیلنے ہیں"۔ اور اس نے کٹوری خالی کر دی۔

دسوندھا سنگھ نے اس کے گلاس میں "کِکر سنگھی" ڈالی تو وہ گھونٹ لیتے ہوئے بولی "ابھی تو ہمیں بہت دُور جانا ہے"۔

"اے لونڈیا — اے چھوری — ہماری گلو کی جان" دسوندھا سنگھ نے کہا — "تو بھی ایک طلسم ہے۔ تیرا طلسم دیکھوں کہ اکال پُرکھ کا — قسم واہگورو کی — گلو کی جان — ڈرامہ نویس سے اپنا ہی حال لکھواؤ گی یا ہمارا بھی — اے گلبدن"۔

یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کی باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ نیند پرے باندھ کر آ رہی تھی۔

کتا بڑے پیار سے دُم ہلاتا ہوا اپنا بدن دسوندھا سنگھ کے بدن سے رگڑ رہا تھا۔

سب اونگھنے لگے۔ سب سے پہلے چچا جھومو خراٹے لینے لگا۔ جیسے وہ خود پیر پنچال ہو۔

دسوندھا سنگھ کی آنکھ نہ لگی۔ کتا اس کی پیٹھ سے اپنی پیٹھ رگڑ رہا تھا۔ دسوندھا سنگھ نے کِلّر سنگھی کا آخری پیگ اس کے منہ میں انڈیلتے ہوئے کہا "رے بیٹا۔ آج مزے سے سونا۔ اگر خواب میں کہیں پیر پنچال ملے تو اُس سے کہنا "اے پیر فقیر۔ تیرے راج میں دسوندھا سنگھ ڈرائیور کو تکلیف نہیں ہونی چاہیئے"

کتا بڑی احسان مند نگاہوں سے دسوندھا سنگھ کی طرف دیکھنے لگا اور پھر وہ بھی سو گیا۔

دسوندھا سنگھ گنگنانے لگا۔

"تیرے سامنے بیٹھ کے رونا (تیرے سامنے بیٹھ کر مجھے رونا ہے)

تے دکھ تینوں نہیں دسنا" (اور تجھے اپنا دُکھ نہیں بتانا ہے)

دسوندھا سنگھ کی نظر بار بار گل ہما کی طرف اُٹھ جاتی جس کا چہرہ بجھتی آگ کی روشنی میں اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ جیسے آگ برف میں دھنس رہی ہو اور برف آگ میں اُتر رہی ہو۔ اُس کے جی میں تو آئی کہ وہ اُسے جگا کر اُس سے اُس کی کہانی سنے لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس سڑک پر نہ جانے کتنی بار لالہ رُخ کس کس روپ میں دیدار دے گی۔

اُس کی نگاہ گل ہما کی طرف اُٹھ جاتی اور اس کا ہاتھ خود بخود سوئے پڑے کتے کی پیٹھ پر پھرنے لگتا۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

گل ہما نے کروٹ بدل کر نیم وا آنکھوں سے دسوندھا سنگھ کی طرف دیکھا جو ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

کلونت سنگھ ورک

کھبّل

پاکستان قائم ہوئے ابھی تین چار مہینے ہی ہوئے تھے۔ ہر شے درہم برہم دکھائی دے رہی تھی۔ پولس تھانوں اور چوکیوں میں سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ٹرنک، پلنگ، پنگھوڑے، صوفے اور تصویریں۔ سب اپنی اپنی جگہ سے اُکھڑ کر تھانے پہنچ گئے تھے۔ پولس تھانوں میں پنگھوڑوں اور تصویروں کا بھلا کیا کام؟ کبھی ان کو گھروں میں خاص مقام حاصل ہوگا۔ اُس وقت گھر والوں کو یہ خیال ہوگا کہ اگر ان کو اس مقام سے کسی اور جگہ رکھا گیا تو یہ بہت ہی بھدّے معلوم ہوں گے لیکن اِس وقت وہ یہاں اک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ گھروں کے برتن الماریوں، پرچھتیوں اور رسوئیوں سے نکال کر سرکاری دفتر کے سامنے ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ اب ان کو کسی نے سنوارا نہیں تھا، چمکایا نہیں تھا۔ گِنا نہیں تھا — ان کو کسی مرد یا عورت کا ہاتھ لگے بھی کئی مہینے ہو چکے تھے۔

پاکستان میں ہر شے درہم برہم اور تہ و بالا تھی۔ کئی گھروں میں اپنے ٹھکانوں سے بچھڑے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی تھے۔ وہ گرد و پیش پر خوفزدہ نگاہیں ڈالتے اور پرائی جگہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے — اس اُتھل پتھل میں صرف دھرتی ہی اپنی جگہ پر برقرار تھی اور اس دھرتی پر ان گنت مہاجر لڑھکتے اور رینگتے پھر رہے تھے۔ واگہ کے کیمپ سے ان کو آگے کی طرف دھکیل دیا جاتا تھا اور پھر وہ مہاجر ضلع سے گاؤں تک پیدل یا چھکڑوں میں زمین کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔

مہاجر تو ایک طرف رہے پُرانے لوگ بھی اُکھڑ گئے تھے۔ برادری والوں کی برادریاں ٹوٹ گئی تھیں اور یاروں کے یار بچھڑ گئے تھے۔ مزدوروں کی ملوں کے مالک چلے گئے تھے اور ملوں کے مزدور۔ اُن کی جگہ نئے لوگ آ گئے تھے۔ یہ نئے لوگ کیسے تھے۔ پریشان سے، بوکھلائے ہوئے سے۔ پُرانے لوگوں میں گھُل مِل نہیں سکتے تھے۔ سلام علیکم کہہ کر اور پاس بیٹھ کر بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ دروازے میں کھڑے ہو کر اندر جھانکتے تھے۔ وہ بلانے پر نہ بولتے۔ ان لوگوں نے دیہات کی جڑیں ہلا دی

تھیں۔ پُرانے باشندوں کو بھی اپنے گاؤں پرائے اور اوپرے سے معلوم ہونے لگے تھے کیونکہ وہ ویسے گاؤں نہیں رہے تھے جن میں وہ پیدا ہوئے تھے اور پلے تھے۔ ان کی حویلیوں کے قریب سے گزرتی ہوئی نہریں اور نالے بیگانے ہو گئے تھے۔ اب وہ وہاں وضو نہیں کر سکتے تھے۔ کئی دنوں سے ان نہروں میں لال پانی آتا رہا تھا۔ ثابت مردے، کئی لوگوں کی ٹانگیں اور بازو بہتے چلے آ رہے تھے۔ اس پانی سے وضو کیونکر کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو اپنے بچوں کو بھی اس پانی میں نہانے سے روک دیتے۔ دراصل ہر شے تہ و بالا ہو چکی تھی، اور اپنی پُرانی حالت پر واپس آنے کا جتن کر رہی تھی۔ ہر چیز اپنے مقام کو تھامنے اور پاؤں جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہر شے نیا استحکام طلب کر رہی تھی۔

"ملک تو تباہ ہو گیا ہے" ایک گھبرو جاٹ نے اردگرد ویرانی دیکھ کر اپنے بوڑھے باپ سے کہا۔

"ہو تو گیا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھ کہ لوگ جگہ جگہ آباد ہوتے جا رہے ہیں۔ جلد ہی امن چین ہو جائے گا۔"

"یہ تو یوں ہی باتیں ہیں۔ یہ بچارے کہاں بیٹھیں گے۔ یہ تو نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالنے کے قابل نہیں ہیں۔"

"نہیں پگلے — یہ بس یوں ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ دیکھ کیاری میں کھبل گھاس (جڑ دار گھاس اُگی ہے) جب جتائی کی جاتی ہے تو اس میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ سارا جڑ سے اُکھاڑ کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن اس دن کے بعد پھر کوئی نہ کوئی جڑ پھوٹ پڑتی ہے اور ایک مہینہ بعد یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کیاری میں کسی نے جتائی کی ہی نہیں تھی۔"

اصل میں کہیں کہیں اُس بوڑھے کی بات میں سچائی نظر آ رہی تھی۔ جن لوگوں کو زمین مِل جاتی وہ کچھ ٹِک سے جاتے۔ جو زمینیں الاٹ ہوتیں وہ ان کی کچھ ڈھارس سی بندھا دیتیں۔ اپنی نئی زمینوں کے پاس وہ چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر اُن میں اُپلوں کی آگ جلائے رکھتے اور جب جی چاہتا اس کی آگ کو حقے پر رکھ کر کھٹے پیتے۔ آہستہ آہستہ ان کی بھینسوں کا بھی ڈر دور ہو جاتا۔ باڑے کے اندر وہ جنگل کی ٹہنیوں سے اپنی پچھاڑیوں کو کھجاتی رہتیں اور کبھی کبھی مزے میں آ کر اپنے بدن کو باڑے کی دیواروں سے رگڑتی رہتیں۔ جب کوئی تحصیلدار یا کوئی اور افسر اِن لوگوں کے نئے گاؤں میں آتا تو ان میں سے کئی لوگ اپنے آپ کو پنچ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ گاؤں کے سانجھے دکھ اور تکالیف تحصیلدار کو سناتے اور اس طرح سب لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے گاؤں میں اپنی لیڈری کی بنیاد رکھتے۔ سیدھی سادی باتوں سے یعنی لوگوں کو پیچھے بٹھا کر "صرف ایک آدمی بولے" کہہ کر افسر کو حقہ پیش کرتے ہوئے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچتے۔ یہ باتیں ظاہر کرتی تھیں کہ اس صدمہ نے بھی حقیقت میں ان کو ٹھنڈا

نہیں کیا تھا۔

اس طرح کے اُجڑتے اور آباد ہوتے ہوئے پاکستان میں حکومتِ ہند کی طرف سے میں تال میل آفیسر مقرر ہوا۔

میرا کام یہ تھا کہ زبردستی اغوا کی گئی عورتوں اور جبر سے مسلمان بنائے گئے خاندانوں کو واپس ہندوستان پہنچا دوں۔ ہندوستانی فوج کا ایک دستہ اور پاکستان کی سپیشل پولس کے چند سپاہی اس کام میں میری مدد کر رہے تھے۔

گُم ہو جانے والی دیگر چیزوں کی تلاش کی طرح یہ تلاش بھی بہت دشوار تھی اور بہت آسان بھی تھی۔ کبھی کبھی تو کوئی لڑکی ذرا سی محنت سے مِل جاتی تھی اور کئی دفعہ لڑکی سرگرم تلاش کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتی تھی۔ پاکستان کے پولس والے ان کو لوٹانے میں جس کو وہ برآمدگی کہا کرتے تھے تھوڑی بہت مدد کر دیا کرتے لیکن خود بہت کم پتہ دیتے تھے۔ لیکن جب وہ صدق دلی سے ساتھ ہو لیتے تو کام آسان ہو جاتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ علاقے کا تھانیدار نہ صرف میرے ساتھ چل پڑا بلکہ اغوا کی ہوئی عورت کا پتہ بھی اُس نے مجھے دیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ عورت اس پولس تھانہ کے تحت ایک گاؤں کے نمبردار کی بہو تھی۔ جس گاؤں میں ہمیں جانا تھا وہ پکّی سڑک سے بہت دور تھا۔ اس کے بعد ہم کچّی سڑک اور پگڈنڈیوں پر بھٹکتے رہے۔

جب ہم گاؤں میں پہنچے تو گاؤں کے چودھری تھانیدار کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے ــــ پاکستان میں اس وقت حکومت کا بڑا رُعب تھا۔ تھانیدار نے اُس عورت کا پتہ پوچھا تو اُن چودھریوں نے فوراً اس کو ایک مکان دکھا دیا۔ وہ مکان ایک بہت بڑے احاطے کے سرے پر بنایا گیا تھا۔ تھانیدار اور دوسرے لوگ باہر رہے اور میں اندر چلا گیا۔ وہ کچّا مکان ایسا تھا کہ اُس میں صرف تین چارپائیاں بچھ سکتی تھیں ایک طرف لکڑی کی پرچھتی پر تھوڑے سے گلاس، کٹوریاں، تالیاں پڑی تھیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں بستر اور تھوڑا بہت سامان بھی تھا۔

وہ عورت چارپائی پر پڑی تھی۔ کئی دنوں سے اُسے بخار آ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹّیاں بندھی ہوئی تھیں۔ شاید کوئی پھوڑا ہو گیا تھا۔ اُس وقت وہ بہت نڈھال اور مضمحل معلوم ہوتی تھی۔ وہ اصل میں آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ میں اُس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی مزاج پُرسی کے لیے سیدھا سا سوال کیا۔

"چار پانچ روز سے بخار آ رہا ہے۔"

"کیا یہاں تمہارے پاس کوئی عورت نہیں؟"

"نہیں — آس پاس کوئی نہیں۔"

میں نے اس سے پہلے جو چھینی ہوئی لڑکیاں اور عورتیں دیکھی تھیں ان سے اِس کا ماحول مختلف تھا۔ ان کے اردگرد مرد اور عورتیں ہوتی تھیں۔ وہ کسی کی نظر میں اور کسی کی نگرانی میں رہتی تھیں اور اُسی طرح مجھے دکھائی جاتی تھیں۔ مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے وہ اس مکان میں اکیلی ہی رہتی تھی اور لوگوں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ علاوہ ازیں لوگوں نے جیسے اس کی مدد کی تھی۔ اس کے گاؤں کے لوگ اور گھر کے لوگ کیسے ختم ہوئے، یہ بات میں پہلے ہی سُن چکا تھا۔ اس کے مُنہ سے وہ قصہ دوبارہ سننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اُس کی موجودہ حالت میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

"یہاں رہتے ہوئے تمہیں کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟"

"جس دن گاؤں اُجڑا اُس دن سے یہاں ہوں۔"

"یہ برتن اور کپڑے تمہیں کس نے دئے ہیں؟"

"آپ تو پاگل ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اکیلی نہیں تھی اور نہ وہاں پڑا سامان اُس کا اپنا تھا۔ اُس مکان، سامان اور اس کے جسم کا مالک آنکھوں کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یہ بات یہاں لکھتے ہوئے تو میں آسانی سے لکھ گیا ہوں لیکن اُس وقت میرے اس علم نے میرے دل پر صدمہ کی ایک گہری چوٹ لگائی — پولس اور لوگوں کی امداد سے جو اچھے اچھے خیال میرے دل میں دُنیا اور دُنیا کے لوگوں کے بارے میں دن بھر آتے رہے تھے وہ سب مجھ سے اپنا دامن چھڑا گئے۔ میرا واسطہ تلخ حقائق سے پڑ رہا تھا۔ اس مکان میں کسی کی چھینی ہوئی بیوی میرے سامنے چارپائی پر نڈھال پڑی تھی۔ میری نظر میں انسان پر انسان کے ظلم کی وہ سب سے زیادہ سنگدل تصویر تھی۔

کچلی ہوئی اور ذلیل و خوار کی ہوئی وہ عورت وہاں بیمار پڑی تھی۔ اُس کی ذات برادری، گاؤں اور دھرم کا کوئی ساجھی وہاں نہیں تھا۔ اس کو کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے خویش و اقارب سے پھر بھی مل سکتی ہے۔ اگر اُسے کوئی بتاتا بھی تو وہ ماننے سے انکار کر دیتی۔ آخر اتنے بڑے اور طاقتور پاکستان میں سے کوئی اُسے کیونکر نکال کر لے جا سکتا تھا۔ اس بات کے بارے میں سوچنا ہی فضول تھا۔

اُس وقت اُسے واپس لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دسمبر جنوری کی سردی میں اور بیماری کی حالت میں اُسے وہاں سے لے جانا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ لوگ اب اُسے گم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ

ہم نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ ہم اسے دیکھ چکے ہیں۔

"اچھی بات ہے۔ میں کسی دن پھر آؤں گا۔" پھر آنے سے میرا مطلب اس کو وہاں سے واپس لے جانا تھا لیکن یہ بات شاید اُس کے خواب و خیال میں بھی ممکن نہیں تھی۔

"آپ اس وقت جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"ذرا بیٹھ جائیے۔ میری ایک بات سُن لیجئے۔"

میں پھر اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"میں آپ سے ایک درخواست کر رہی ہوں اگر آپ پوری کر سکیں۔ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟"

"آپ میرے سِکھ بھائی ہیں۔ میں بھی کبھی سکھ ہوا کرتی تھی۔ اب میں مسلمان ہو گئی ہوں۔ اس وقت اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں — آپ میرا بازو پکڑ لیجیے۔ میری ایک نند ہے — چھوٹی نند — ان کا بیڑا غرق ہو جائے۔ گیارھویں چک والے اُسے لے گئے ہیں اس دن حملے میں سب سے بڑا جتھہ اُن ہی کا تھا۔ اور وہی اس کو لے گئے ہیں۔ اس وقت مجھے آپ کا بڑا اثر و رسوخ محسوس ہو رہا ہے آپ اُس کو میرے پاس لے آئیے۔ سب آپ کا لحاظ کرتے ہیں۔ پولس والے بھی آپ کی بات مانتے ہیں۔ میری طرف سے بھی ان کی منت سماجت کیجیے۔ میں اس کی بڑی بھابی ہوں۔ میں نے اُسے اپنے ہاتھوں سے پالا ہے — ماں کے برابر ہوں — وہ میرے پاس آئے گی۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کو کسی کے دامن سے باندھ دوں گی۔ میرا سانجھا پن بڑھے گا۔ میرے بازو پیدا ہوں گے۔ میں کسی کو اپنا کہنے والی بنوں گی۔"

میرے دماغ میں اُس بوڑھے جاٹ کی بات گھومنے لگی "وہ دیکھو کیاری میں کھبل یعنی جڑدار گھاس ہوتا ہے۔ جب جُتائی کی جاتی ہے اس کے ساتھ کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ کیاری سے سارا جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے لیکن دس دن کے بعد پھر کوئی نہ کوئی جڑ پھوٹ پڑتی ہے۔"

امرتہ پریتم

ایک حسرت ایک آہ

کرمو نے لوٹے میں لسی ڈلوائی اور پھر آدھے سے بھی زیادہ خالی لوٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی — "آج بڑی سردارنی دکھائی نہیں دیں — وہ خیریت سے تو ہیں نا؟"

سردارنی نہال کور ابھی چند منٹ پہلے چوکے میں آئی تھی۔ چولھے پر پکتی ہوئی کھیر کے نیچے آگ کا بگولا دیکھ کر اُس نے لکڑیاں پیچھے کھینچ لی تھیں "ویرو — کھیر کبھی اتنی آگ پر بھی پکتی ہے — ؟ کھیر کے نیچے تو بڑی مدھم آگ جلائی جاتی ہے"

اُس نے کہا تھا اور پھر چولھے کے پاس لکڑی کی چوکی بچھا کر اُس پر بیٹھتے ہوئے کھیر کی دیگچی میں کڑچھی گھمانے لگی تھی۔ اُس نے صبح دہی کی چائی خود بلوئی تھی لیکن لسی نتھارنے کے لیے ویرو سے کہا تھا کیونکہ وہ اب تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہتی تھی۔ کوئی غریب نوکر چاکر آئے تو ویرو اُسے لسی دیدے۔

شاید کچھ اور غریبوں نے بھی یہ سوال کیا ہوگا۔ لیکن نہال کور کو اس کا علم نہیں تھا — وہ اندر کے کمرے میں تھی۔ مگر اس دفعہ جب وہ چوکے میں بیٹھی تھی تو دہلیز کے باہر بیٹھی ہوئی کرمو کی آواز اُس نے خود سُنی۔

"راضی ہوں کرمو — تو راضی ہے — ؟" نہال کور نے اندر سے آواز دی۔ کرمو نے تیزی سے دہلیز کے قریب آکر اندر کی طرف دیکھا اور اپنے ایک ہاتھ سے اپنے ماتھے کو چھوتے ہوئے بولی۔

"سردارنی — تمہاری خیر ہو — صحیح سلامت رہو۔ آج تم دکھائی نہیں دیں۔ مَیں نے سوچا کہ میری سردارنی خیریت سے ہو —"

نوکر چاکر کمین سبھی سردارنی نہال کور کی بلائیں لیتے اور صدقے جاتے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی نہال کور کو ایسا محسوس ہوا کہ کرمو نے لسی لیتے ہوئے اسے جو یاد کیا تھا ضرور اس میں کوئی بات تھی۔ نہال کور نے جب اس کی طرف دیکھا تو کرمو نے لوٹے کا مُنہ اس کی طرف کر رکھا تھا۔

نہال کور سمجھ گئی اور دیرو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "سُنو۔ کرمو کا لوٹا بھر دیا کرو۔ اس کے لسی پینے والے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"خدا تمہیں زیادہ دے ۔۔ تمہارے ہاتھوں میں ایسی برکت ہے کہ بچے دو دو بار لسی چڑھا جاتے ہیں۔" کرمو نے اور لسی لیتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اس وقت لسی دینے والے ہاتھ دیرو کے تھے۔ لیکن کرمو جو کچھ کہہ رہی تھی وہ نہال کور کے ہاتھوں کے بارے میں کہہ رہی تھی۔

کرمو چلی گئی تو نہال کور اُس کی اسیسیں بھول گئی۔ لیکن اُس کا کہا ہوا ایک لفظ یاد رہ گیا۔

"بڑی سردارنی ...."

نہال کور ایک دن میں سردارنی سے بڑی سردارنی بن گئی تھی۔ معلوم نہیں اُسے بڑی سردارنی کہنے کا خیال سب سے پہلے کس کو آیا تھا۔ شاید سب کو ایک ساتھ آیا تھا۔ گھر کی مہری سے لے کر کارخانے کے تمام منشی اور منیم اور مزدور اُسے بڑی سردارنی کہنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ گھر کے مالک سردار نے بھی کل اُسے بڑی سردارنی کہہ کر بلایا تھا۔ پھر نہال کور کو یہ خیال آیا کہ پرسوں اُس نے خود ہی تو مہری سے کہا تھا کہ جاؤ چھوٹی سردارنی کو اس کے کمرے میں سے بلا لاؤ۔ چھوٹی سردارنی کی موجودگی میں اس کا بڑی سردارنی بن جانا لازمی تھا۔ نہال کور کو یہ خیال آیا اور پھر کتنے ہی خیال چھوٹے چاولوں کی طرح اس کے دل کے دودھ میں پکنے لگے۔

پکتے خیالوں میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ دیرو جب سے اس گھر میں چھوٹی سردارنی بن کر آئی تھی تب سے وہ سونے سے پہلے ایک فرض کی طرح اُس کے کمرے میں آیا کرتی تھی اور اس کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اُس کے پاؤں دبایا کرتی تھی۔ نہال کور کو نہ تو کسی بیٹی کی ڈولی وداع کرنی تھی اور نہ بیٹے کی ڈولی گھر میں لانی تھی لیکن جب اُس کے اپنے ہاتھ سے بیاہی اُس کی سوت اُس کے پاؤں دابتی تھی تو نہال کور کو اب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس نے بیٹی بھی دیکھ لی اور بہو بھی۔ اور نہال کور نے ایک گہرا سانس لے کر مسکراتے ہونٹوں سے اپنے آپ کو منا لیا تھا کہ دیرو اُس کی بیٹی بھی تھی اور بہو بھی۔

نہال کور نے اپنے سردار کی دوسری شادی کے لیے یہ لڑکی دیرو خود ہی تلاش کی تھی۔ رشتے اچھے گھرانوں کے بھی ملتے تھے لیکن وہ تمام رشتے سردار کو نہیں بلکہ سردار کی حویلی کو ملتے تھے۔ سردار کی کہن سالی سے ڈرتے ہوئے جو لوگ بھی رشتہ لے کر آتے تھے وہ رشتہ کرنے سے پہلے حویلی اپنی بیٹی کے نام کروانا چاہتے تھے۔ سردار اپنی حویلی کا وارث ضرور ڈھونڈ رہا تھا لیکن وہ حویلی کو اس عورت کے نام نہیں کر سکتا تھا جس نے وارث کو شاید نہ جانے کب جنم دینا تھا اور فی الحال اسے وارث کے بارے میں

صرف پیشگوئی کرنی تھی۔

سردار نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس انکار میں ایک حسرت اور ایک آہ جذب تھی۔ نہال کور نے یہ آہ سُنی تھی اور اُس نے ایک غریب گھرانے کی یہ ویرو ڈھونڈ کر اپنے سردار کو دیدی تھی اور اس کے عوض میں اس کی حسرت اور آہ خود لے لی تھی۔

ایک دن سردار نے دیوار میں لگی ہوئی اپنے لوہے کی الماری کھولی اور بڑی دیر تک اس الماری کے آگے کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ "بڑی سردارنی کہاں گئی ہے؟"

سردار نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ بڑی سردارنی گھر میں نہیں تھی۔ سردار نے الماری بند کر کے چابی جیب میں ڈال لی اور کارخانہ جاتے ہوئے ویرو سے کہہ گیا کہ نہال کور جب بھی گھر میں آئے وہ نیچے منشی کو آواز دے کر اُسے کارخانہ میں پیغام بھیج دے — نہال کور جب آئی ویرو باہر کے حوض پر بڑی گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُسے ابھی ابھی ایک متلی آئی تھی۔

نہال کور نے ویرو کا بازو تھام لیا۔ اُس کے کندھے دبائے اور اُسے اندر لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ لیکن ویرو نے کانپتے کانپتے اپنے پاؤں چارپائی پر سے اُٹھا لیے اور دور کر نہال کور کے پاؤں پکڑ لیے۔

"سردارنی جی — آپ نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ میں آپ کی بیٹی بھی ہوں اور بہو بھی — آج مجھے اپنی بیٹی سمجھ کر بچا لو یا بہو سمجھ کر۔" ویرو گڑگڑانے لگی اور گڑگڑاتے اور لجاتے ہوئے اُس نے نہال کور کو بتایا کہ پچھلے دنوں جب اُس کا بھائی اُس سے ملنے آیا تھا تو اس کے بھائی کو کچھ پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے اُسے کچھ پیسے دیئے تھے۔ لیکن اس وقت پیسے اس کے پاس بہت کم تھے اس لیے اُس نے سردار کی جیب سے الماری کی چابی چُرا کر لوہے کی الماری کھولی تھی اور الماری میں سے چاندی کے برتن نکال کر اپنے بھائی کو دیدیئے تھے۔

"یہ تیرا اپنا گھر ہے ویرو — اگر تم اپنے گھر کو اپنے ہاتھ سے اُجاڑو گی ....."

بات ابھی نہال کور کے ہونٹوں میں ہی تھی کہ ویرو چونک کر اُٹھی "یہ گھر نہ مجھے کبھی اپنا لگا ہے نہ لگے گا۔ لیکن میں آپ سے یہ وعدہ کرتی ہوں سردارنی جی کہ آئندہ میں اس گھر کی چیز کبھی کسی کو نہیں دوں گی۔ میں نے اس دن غلطی کی۔ یوں ہی کر بیٹھی۔ میں بعد میں بہت پچھتائی تھی۔ آپ جانتی ہیں کہ میرے باپ نے میرا بیاہ کرتے ہوئے میرے بھائی کے کاروبار کا واسطہ دے کر آپ سے دو ہزار روپے مانگے تھے اور آپ نے دو ہزار روپے دیدیئے تھے۔ میرے باپ نے میری شادی کر دی۔ مجھے بیچنے میں کیا کسر رہ گئی۔ دو ہزار روپے کی خاطر مجھے اس بوڑھے سردار کے حوالے کر دیا گیا۔ میرا باپ اور میرا بھائی میرے سگے کہاں ہیں ..... میں

کسی کا گھر اُجاڑ کر اُن کا گھر کیوں بھروں ....."

"ویرو ....." نہال کور چونک کر ویرو کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔

نہال کور نے ویرو کی لاج رکھ لی اور سردار سے کہہ دیا کہ الماری میں پڑے ہوئے چاندی کے برتن نکال کر اور کچھ چاندی اپنی طرف سے ڈال کر سُنار کو نئے برتن بنانے کے لیے دیدیئے ہیں۔

سردار کی پریشانی دُور ہوگئی لیکن نہال کور جب بھی ویرو کی طرف دیکھتی اس کے دل میں ایک اضطراب شروع ہو جاتا۔ ویرو کی آنکھیں کالی اور بھُوری تھیں۔ رنگ ذرا سا سانولا تھا لیکن سانولے رنگ میں جوانی سخت آٹے کی طرح گندھی ہوئی تھی۔ اس کی باہیں بیلن کی طرح گول اور گٹھیلی تھیں۔ اس کے گوشت کی چٹکی نہیں بھری جاتی تھی۔ نہال کور کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ سردار سے جو آہ لے کر اُس نے اپنے ذمہ لے لی تھی ویرو نے وہ آہ اس سے لے کر اپنے سینے میں رکھ لی تھی۔

....اور پھر ویرو کے دن چڑھ گئے۔ حویلی بہت بڑی تھی لیکن مبارکبادیں اتنی تھیں کہ اس میں سماتی نہیں تھیں۔ سردار کا پاؤں زمین پر نہیں لگتا تھا اور نہال کور ویرو کو پاؤں زمین پر نہیں اُتارنے دیتی تھی۔ لیکن لوگ نہ تو سردار کو اتنی مبارک بادیں دیتے تھے اور نہ ہی ویرو کو جتنی نہال کور کو دیتے تھے۔

"میں تو پیدا ہوتے ہی اُسے گود لے لوں گی — بعد میں نہ کہنا — میں بڑی سردارنی ہوں — اور تُو چھوٹی سردارنی ہے۔ پہلا بیٹا بڑی کا — بعد میں جتنے بچّوں کو تو جنم دے گی وہ تیرے —" نہال کور کی سمجھ میں خود یہ نہیں آرہا تھا کہ اس کے دل میں ڈھکا چھپا کوئی ذرا سا بھی ملال کیوں نہیں تھا — اُس نے اپنے ہاتھ سے اپنا خاوند ایک پرائی عورت کو دے دیا تھا۔ اور اب اُسے ساری زمین اور جائیداد بھی ایک پرائی عورت کو دے دینی تھی۔

"اے جادوگرنی — میں نے کون سے وقت میں تجھے اپنی بیٹی اور بہو کہا تھا — میں تو سچ مچ ایک ساس اور ماں کی طرح خوش ہوں۔ مجھے کبھی یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ تو میری ....." نہال کور کی اس بات کو ویرو ٹوک دیتی اور ہنس کر کہا کرتی — "سردارنی جی — میں اگرچہ آپ کی کچھ نہیں لگتی لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ میں آپ کی سوت نہیں ہوں"۔

نہال کور نے بڑھئی سے جو پنگھوڑا بنوایا اُس پنگھوڑے سے چاندی کی گھنٹیاں باندھ دیں۔ اس نے کمخواب کی چھوٹی سی رضائی بنوائی۔ شہر کا ایک انگریز افسر ایک مہینے کی چھٹی پر ولایت جا رہا تھا۔ "ولایتی سوئٹر ریشم کی طرح ہوتے ہیں" — نہال کور نے کہا اور اُس انگریز کو دو بار یاد دلایا گیا کہ وہ چھوٹے چھوٹے دو سوئٹر وہاں سے خرید کر ضرور لائے۔

نہال کور نے اپنے وقت پر اپنے آپ کو سمجھدار اور تجربہ کار دائیوں کو بھی دکھایا تھا اور شہروں کے ڈاکٹروں کو بھی لیکن اپنے وقت پر اس نے کبھی کسی دیوی دیوتا کی منّت نہیں مانی تھی۔ جب پورے تین دن ویرو کی کمر میں درد ہوتا رہا اور ایک دن خون کا ذرا داغ بھی لگا تو نہال کور نے اُس دن پہلی بار اپنی زندگی میں منّت مانی۔

وہ ناز کرنے کا وقت تھا۔ ویرو اگر چاہتی تو دور دراز کی فرمائش بھی کر سکتی تھی۔ سردار اب اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتا اور اُس کے مُنہ سے نکلنے والی بات کا انتظار بھی کرتا۔ لیکن نہال کور کو معلوم تھا کہ ویرو کا مُطالبہ اب بھی اتنا تھا کہ اگر اُسے نگوڑی آچار کی پھانک بھی مانگنی ہوتی تو وہ نہال کور کے مُنہ کی طرف دیکھا کرتی۔ اس لیے نہال کور خود ہی ویرو کے دل کی بات کا خیال رکھتی تھی۔ اس دوران میں ویرو نے اگر کوئی بات زوروں سے کہی تھی تو صرف یہی کہی تھی کہ دالان میں شلجم کے ٹنگے ہوئے ہار اُتار کر رکھ دو۔ "اِن کو دیکھ کر میرے جی کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ شلجم کی سوکھی پھانکیں مجھے اس طرح معلوم ہوتی ہیں جیسے کسی کا گوشت پلپلا رہا ہو۔" ویرو نے یہ کہا تھا اور سوکھے شلجموں کی طرف دیکھ کر اُسے متلی آنے لگی تھی۔

....اور پھر ویرو کے دل میں نہ جانے کیا آیا۔ جب اُسے نواں مہینہ لگا تو اُس نے یہ ضد پکڑی کہ وہ اپنے میکے میں اپنی زچگی کے دن کاٹے گی۔ سردار اُس کی ضد کو نہیں مانتا تھا۔ نہال کور اُسے واسطے دیتی تھی لیکن ویرو نے صرف ایک ہٹ پکڑ لی تھی کہ اُس کے گاؤں میں ایک بوڑھی دایہ ہے جو بہت سمجھدار ہے۔ اُسے صرف اس دایہ پہ اعتبار تھا اور کسی پر نہیں۔ اور اُسے یہ یقین تھا کہ اگر وہ یہاں رہی تو شہر کی ڈاکٹرنیوں کے ہاتھوں مر جائے گی۔

"یہ ڈر بہت خراب ہوتا ہے۔" ڈاکٹروں نے بھی سردار کو مشورہ دیا۔ لیکن سردار کے دل میں کچھ اور ہی ڈر تھا۔ وہ نہال کور کو خلوت میں لے جا کر کہنے لگا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اگر اس کے یہاں لڑکی ہوئی تو اس کے والدین کسی کے بیٹے سے اس لڑکی کو بدل ڈالیں گے۔ میں نے اس کی بہت سی باتیں سُن رکھی ہیں۔ ان کو لالچ ہوتا ہے کہ اگر لڑکا ہو گا تو بڑا ہو کر جائیداد کا وارث بنے گا۔"

"پھر اس کا تو یہ علاج ہے کہ مَیں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اگر میں پاس ہوں گی تو دائیاں کچھ نہیں کر سکیں گی۔" نہال کور نے سوچ کر کہا۔

سردار مان گیا۔ ویرو نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ نہال کور نے گھر کی مہری کو بھی خدمت کے لیے ساتھ لے لیا اور ویرو کو لے کر ویرو کے میکے چلی گئی۔

ویرو کا وضعِ حمل دشوار ثابت نہ ہوا۔ وہ بھرپور جوان تھی۔ تندرست بھی بہت تھی۔ اُس کی ماں اور بھابی بھی اُس سے مذاق کرتی تھیں "یہ تو یوں ہی ڈرتی ہے — بیٹے کو جنم دینے کا کیا ہوتا ہے۔ ایک بار چیخے اور بیٹے کو جنم دے دیا۔"

نہال کور نے ویرو کے میکے والوں پر کوئی بوجھ نہیں پڑنے دیا تھا۔ وہ کھُلے ہاتھ سے خرچ کرتی تھی۔ سب اُسے سردارنی سردارنی کہتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ نہال کور ہنس کر کہا کرتی — "ایک بار چیخے اور بیٹے کو جنم دے دیا۔ لیکن اگر بیٹی کو جنم دینا ہو تو ....."

ویرو کی بھابی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہتی — "دو بار چیخے اور بیٹی کو جنم دے دیا۔"

"بیٹی کی باری میں دو چیخیں کیوں؟" نہال کور ہنس کے پوچھتی۔

"ایک چیخ درد کی — دوسری چیخ غم کی —" ویرو کی بھابی کہتی — "خوشی تو بیٹوں کی ہوتی ہے۔ بیٹیوں کی کیسی خوشی۔"

نہال کور کے دل میں اگرچہ ایک بار سخت ٹیس اٹھی "میں نہ تو کبھی ایک بار چیخی اور نہ دو بار ....." لیکن اُس نے اپنے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی ٹیس کو اس طرح پی لیا کہ اُس کی ٹیس اُس کے مُنہ کی طرف دیکھ کر شرمندہ ہو گئی۔

اور پھر جس رات ویرو کے درد ہوا تو اس کے دانتوں تلے دبے ہوئے ہونٹوں نے اس درد کو یوں برداشت کر لیا کہ دوسرے کونے تک آواز نہ پہنچی۔ اس کی چیخ صرف ایک بار سنائی دی اور پھر دایہ نے ویرو کے سرہانے بیٹھی نہال کو دیکھ کر کہا "سردارنی مبارک ہو — آؤ — تمہاری جھولی بیٹے سے بھر دوں۔"

نہال کور نے بیٹے کو بھی اور مبارکبادوں کو بھی جھولی میں ڈال لیا۔ اور صبح جب وہ سردار کو تار دینے لگی تو ویرو نے نہال کور کو اپنے پاس بلا کر اپنے دونوں ہاتھ اُس کے پیروں پر رکھ دئے "سردارنی جی۔ — میں ساری دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتی ہوں لیکن تمہارے آگے نہیں — یہ لڑکا آپ کے سردار کا نہیں....."

"ویرو —" نہال کور کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔

"میں سردار کی دیندار نہیں ہوں۔ آپ کی دیندار ہوں۔ اگر اس لڑکے کو صرف سردار کے دالان میں کھیلنا ہوتا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں اسے آپ کی جھولی میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ آپ کی جھولی کے قابل نہیں ہے۔"

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے ویرو؟"

"میں نے جو کچھ کیا تھا وہ مذاق مذاق میں کیا تھا لیکن کئی دفعہ مذاق شاید یوں ہی وبال جان بن جاتا ہے۔ میں آپ کو سچ بتاؤں۔ میں پچھتا نہیں رہی ہوں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ اگر کوئی پچھتاوا ہے تو آپ کے لیے ہے۔"

"وی ــــ رو ــــ"

"آپ کو یاد ہوگا کہ میں ایک بار میکے آئی تھی۔ پچھلی دفعہ .... آپ کا منشی میرے ساتھ آیا تھا۔ میکے والوں سے مجھے ملانے کے لیے ..... یہاں سارے گاؤں میں ایک بات پھیلی ہوئی تھی۔ کہ میرے والدین نے روپے لے کر مجھے ایک بوڑھے سردار سے بیاہ دیا ہے۔ سردار جی کبھی اس گاؤں میں نہیں آئے۔ میرا باپ ہی مجھے آپ کے شہر میں لے گیا تھا۔ میں جب گاؤں آئی تو ہر کسی نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میرا سردار کتنا بوڑھا تھا ــ مجھے نہ جانے کیا سوجھی ــ میں نے بات بنانے کے لیے کہہ دیا کہ میری شادی بوڑھے سے نہیں ہوئی۔ آپ کا منشی بہت جوان تھا۔ خوب صورت بھی تھا۔ میں نے اپنی سہیلیوں کو بتایا کہ وہ میرا خاوند تھا۔ سب میری قسمت پر حیران رہ گئیں۔ منشی کو بھی یہ بات بتادی۔ وہ بھی چپکا ہو رہا۔ اور جب میری سہیلیوں نے اس سے چھلّے مانگے تو اس نے سُنار سے چاندی کے چھلّے خرید کر لا دئے۔ میں یہاں پانچ چھ دن رہی۔ ہر روز ہنسی ٹھٹھول کرتے ہوئے مجھے بھی یہ محسوس ہونے لگا کہ میرا بیاہ اسی سے ہوا تھا اور کسی سے نہیں۔"

"ہمارا منشی مدن سنگھ؟"

"اب میں سردار کے گھر واپس نہیں جاؤں گی ــ اور نہ اس لڑکے کو لے جانا ہے ــــ میں اسی لیے ضد کر کے یہاں آئی تھی۔ میری کرنی میرے آگے آئی ــ سردارنی جی ــ آپ سے میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ صرف ایک چیز مانگتی ہوں کہ سردار جی کو اس منشی کا نام نہ بتایئے گا، ورنہ وہ منشی کو نوکری سے جواب دیدیں گے۔"

"لیکن مدن سنگھ کا تو بیاہ ہو چکا ہے ــــ دیر و اُس کے یہاں دو بچے ہیں۔"

"اسی لیے تو وہ ڈرتا ہے کہ اگر سردار کو پتہ چل گیا تو اُس کی نوکری جاتی رہے گی ــ وہ مجھے کہاں اپنے گھر بسائے گا۔ میں اُسے نوکری سے کیوں جواب دلاؤں ــ وہ جہاں رہے خوش رہے ــ کیا ہوا ــ میں نے ایک بار یہ تو دیکھ لیا کہ جوان مرد کیسا ہوتا ہے۔۔۔"

نہال کور نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں ۔ اور جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو ویرو کی جھولی میں پڑا ہوا اُس کا بیٹا اُس کی چھاتی کا دودھ پینے کے لیے مُنہ مار رہا تھا ۔

.... اور نہال کور کو یُوں محسوس ہوا کہ سردار کی جو آہ اُس نے اپنے ذمّے لے لی تھی اور ویرو نے اُس سے وہی آہ لے کر اپنے سینے میں ڈال لی تھی وہ لڑکا اُس وقت اُس آہ کو ویرو کی چھاتی میں سے پینے کی کوشش کر رہا تھا ۔

صبح ہونے تک

کافی رات گئے چنن جاٹ پکے کنوئیں کے کھیتوں کی جُتائی کے بعد تکان سے چور واپس گھر آیا۔ اساڑھ کی پہلی بارش نے فصلِ خریف کی بوائی کے لیے دباؤ ڈال دیا تھا۔ اب زمین کی نمی کا وقت تھا۔ پھر نہ جانے جھڑی لگ جائے یا قحط سالی اتنی طویل ہو جائے کہ فصلیں پیچھے جا پڑیں۔

بیلوں کے آگے چارا ڈال کر اُس نے ہاتھ اور پیر دھوئے۔ کوٹھے پر روٹی کھائی اور سونے کے لیے چارپائی پر گر پڑا۔ مُنہ اندھیرے ہی اُسے جا کر آلوؤں کی کیاری میں جوار بکھیرنی تھی اور پھر شام ڈھلے پکے کنوئیں کے کھیت پر دو بار ہل چلانے کے بعد اُسے مکئی کی بوائی کرنی تھی۔

وہ اطمینان سے اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور آسمان پر چھٹکے ہوئے تاروں کی طرف دیکھتا ہوا نیند کے خمار میں آنکھیں بند ہی کرنے لگا تھا کہ ساتھ کے کوٹھے پر چارپائی بچھاتے ہوئے گھُندا بولا "ایسا دکھائی دیتا ہے چنن کہ تو پکے کنوئیں کے سارے کھیت پر ہل چلا آیا ہے۔ تو بولتا کیوں نہیں۔ تھک گیا ہوگا؟"

چنن چارپائی پر پڑے پڑے بولا "میں نے سوچا کہ اب کوئی کسر کیوں رکھی جائے۔ ذرا جان مار کر ہل چلا لیں۔ ایک تو سالا بیل نہیں چلتا — کھڑا رہتا ہے۔"

"کون سا مینا؟ (مُڑے ہوئے سینگوں والا)"

"نہیں — دوسرا لاکھا (کالا بیل)، قدم تک نہیں اُٹھاتا۔ جبھی تو اتنا وقت ہو گیا۔"

"بھیّا — ساری خوراک کی بات ہے۔" گھُندے نے خدا لگتی کہی۔

"خوراک دے تو رہے ہیں — اپنی بساط کے مُطابق۔" چنن کی آواز میں بے بسی تھی۔

"ہاں —" گھُندے نے چارپائی پر کروٹ لی۔

تاروں بھری نیلی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے چنن اونگھنے لگا۔ اِس خمار میں اس پر نیند کا

جادو ہوا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں تارے دھول کے ذرّے بن گئے اور پکے کنوئیں کے لہر دار مینڈھ اس کے خوابوں میں پھیلنے لگے اور اُس پار مسلطرات میں رہٹ کے بجتے ہوئے کھٹکے کی آواز دھیمی ہوتی چلی گئی اور اس کے ہوش و حواس سے غائب ہو گئی۔

بچنوں ایک کٹورے میں دودھ لیے ہوئے چنن کی چارپائی کے قریب آئی "لو — پکڑو چلّو بھر دودھ پی لو۔"

چنن کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"سیبو کے باپو (والد) کیا تم سو بھی گئے؟" اُس نے چنن کا کندھا جھنجوڑا۔

"ہاں — ہاں —" چنن نے اونگھتے ہوئے کہا۔

"لو — پکڑو — دودھ پی لو گرم گرم۔"

چنن اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور دودھ کا کٹورا تھام کر اونگھتا اونگھتا دودھ پینے لگا۔ آس پاس کوٹھوں پر لوگ چپ چاپ پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھندے کی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ بچنوں پائینتی کی طرف چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اُمس بہت ہی شدید تھی — اُس وقت پانی سے شرابور ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ دُور پہاڑ کی آغوش میں کالی گھٹا گھری ہوئی تھی جس میں کبھی کبھی بجلی کوند جاتی۔ بچنوں نے آہستہ سے کہا "بادل آج شاید پھر چارپائیاں نیچے لے جانے پر مجبور کریں گے۔"

خالی کٹورا اُس نے بچنوں کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی — "ہمیں پوری نیند سونا ملتا ہی کہاں ہے۔ دو راتیں اسی طرح کاٹ دی ہیں۔"

نیند میں جکڑا ہوا چنن پھر چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس نے پائینتی کی طرف پڑی ہوئی چادر اپنی ٹانگوں کے اوپر لے لی۔ بچنوں کی چارپائی پر چھوٹی لڑکی بلکنے لگی۔ بچنوں اٹھی اور اس کے ساتھ جا کر لیٹ گئی۔ اُمس اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ابھی آدھا پہر بھی نہیں گزرا تھا کہ چنن کے بدن میں ایک سوئی سی چبھی — اس نے کروٹ بدلی۔ اسی طرح ایک اور سوئی چبھی اور اس کی نیند ٹوٹنے لگی۔

"کوئی کوئی بوند گرنے لگی ہے ..." اس کے کان میں آواز پڑی۔ جیسے گھندا اپنی چارپائی پر حرکت میں آ گیا ہو۔

"سیبو کے باپو ..." بچنوں نے للکارتے ہوئے کہا "چارپائیاں نیچے اُتارنی ہی پڑیں گی۔"

"یوں ہی پڑی رہو — قیامت نہیں آ گئی —" چنن نے چادر اوپر کھینچ کر ذرا اور سنوار لی "پھر افراتفری مچ جائے گی ....." بچنوں پریشان تھی اور گھبرائی ہوئی تھی۔

"پڑی رہو — کوئی افراتفری نہیں مچے گی" — یہ بات ابھی چنن کے ہونٹوں پر ہی تھی کہ موٹی موٹی بوندوں نے ایک دم دھاوا بول دیا۔ آس پاس تمام کوٹھوں پر افراتفری مچ گئی۔ چارپائیوں، پنگھوڑوں اور چادروں پر پڑے بچے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ چنن بوکھلا کر چارپائی پر پڑی دری لپیٹنے لگا۔ بچنوں نے تُنک کر کہا "تم یہاں کیا گنتی کر رہے ہو — نیچے جا کر چارپائیاں پکڑو۔ میں اوپر سے لٹکاتی ہوں"

بوچھاڑ سے بیزار کچی نیند میں بچے رونے لگے۔

گلی میں کھڑے ہو کر چنن منڈیر پر سے چارپائیاں اور بستر پکڑنے لگا۔ بچنوں بارش میں بوکھلائی ہوئی چارپائیاں اور بستر نیچے لٹکا رہی تھی۔ نہ جانے بادل کہاں سے اتنا جھک آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔

دِیا جلا کر مینہ میں بھیگے ہوئے بچوں کو چنن نے چارپائیوں پر پھینک دیا۔ دالان اور کوٹھریوں کے روزن ڈھک کر پانی میں شرابور بچنوں نیچے آ گئی اور کرتے کا دامن نچوڑتی ہوئی جھلا کر بولی "کتنی دیر سے کہہ رہی تھی کہ بادل سر پر کھڑے ہیں لیکن تم نے سر نہ اُٹھایا"

وہ سب دالان میں چارپائیوں اور لحافوں پر جا گرے۔

بوچھاڑ جس طرح آئی تھی اُسی طرح واپس چلی گئی۔ پرنالوں سے بہتا پانی اب رس رس کر ٹپکنے لگا۔ اندر بے پناہ اُمس تھی۔ دھیرے دھیرے ہوا بالکل بند ہو گئی — دیے کی لو سیدھی تن کر کھڑی تھی۔ بدن کو کاٹتا ہوا مچھر کانوں کے پاس بین بجا رہا تھا۔ سوئے پڑے بچے پسینے میں نہا گئے تھے۔ گرم حبس سے گھر بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔ چنن بدحواس ہو کر بولا "روزن تو کھلے رہنے دیتی"

"مینہ زور سے آ گیا۔ اوپر کون جاتا"

"اندر تو آگ لگی جا رہی ہے۔ مچھر دم نہیں لینے دیتے" چنن نے اپنا بدن کھجاتے ہوئے کہا۔

پسینے میں ڈوبی ہوئی کولو پنگھوڑے پر سسکنے لگی۔ بلکتی ہوئی چھوٹی لڑکی بچنوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے پنکھا کر کے بچوں کو چُپ کرانے کی کوشش کی۔ بڑی لڑکی سیبو پسینے میں نہائی ہوئی اپنے پنگھوڑے پر اُٹھ کر بیٹھ گئی "نیند نہیں آ رہی ....."

"بے بے (ماں) دِیا ہی بجھا دو" سیبو سے چھوٹا بھندر بولا۔ اُسے دیے کی روشنی سے بھی آنچ آ رہی تھی۔

چنن اُٹھ کر باہر گلی میں آیا "اب بوندیں نہیں پڑ رہیں۔ بادل بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا"

"سسری آج کل کی بارش خواہ مخواہ بھگدڑ مچادیتی ہے۔" بچنوں بڑی پڑی اندر سے بولی۔

"بے بے چارپائیاں گلی میں نکال لو۔" سیبو نے بیزار ہو کر کہا۔

"ہاں مُنّی — چارپائیاں گلی میں نکال لیتے ہیں۔" چنن اندر آ کر چارپائی باہر نکالنے کے لیے اُٹھانے لگا۔

بچنوں دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی۔ اب تو بادل کسی طرف دکھائی نہیں دیتا۔ آسمان بالکل صاف ہے۔"

پڑوس کے کمرے سے بڑھئی کی بیوی نے حامی بھری "ہُوا — ایک ایک تارا گن سکتی ہو — ناس پیٹا مینہ جب آتا ہے تو کھلبلی مچادیتا ہے۔"

"بابا — مالک کو کون روکے۔" گھُندے نے اپنی چارپائی اوپر چڑھانے کے لیے اپنی نیچی منڈیر پر اس کا پایہ پھنساتے ہوئے کہا۔

"اب چارپائیاں اوپر ہی چڑھالو — گلی میں نہیں سویا جائے گا۔" بچنوں نے چنن سے کہا جو گلی میں چارپائی بچھا رہا تھا۔

"اب دو گھنٹے کے لیے کیا کھینچا تانی کریں۔ رات آدھی گزر چکی ہے۔ ذرا دیکھ تو سہی کہ تاروں کا جھرمٹ کہاں تک کھسک آیا ہے۔"

"گلی میں کس کس کی چارپائی بچھاؤ گے۔ سوڈھور ڈنگر بھی ساتھ ہوں گے۔ کوٹھے پر ہی چلو۔ میں تمہیں چارپائیاں پکڑاتی ہوں۔ ایک پل آرام سے تو گزرے۔"

"اچھی بات ہے۔ لاؤ چارپائیاں پکڑاؤ — سیبو تم بچوں کو اُٹھالو۔ بھندرا اٹھ — چارپائیاں باہر نکلوا —" یہ کہہ کر وہ سیڑھی کے پایے پر پاؤں رکھ کر منڈیر پر جا بیٹھا۔

بچنوں نے بازو اوپر اُٹھا کر چارپائیاں اور بستر اُسے پکڑا دئے۔ چنن نے دوبارہ بچوں کو ان کی جگہ پر لٹا دیا۔ بچنوں نے دیا بجھا کر دروازے پر تالا لگایا اور سیڑھی کے بالائی پایے پر پاؤں رکھتے ہوئے بولی — "اے واہگورو — نیچے کے بجائے اوپر سانس تو آیا۔"

بچوں کو چارپائیوں پر لٹا کر جب وہ روزن کھولنے کے لیے گئی تو کوٹھری کی زمین میں اس کے پاؤں دھنس گئے اور واپس آتے ہوئے منڈیر پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ بمشکل گرنے سے بچی اور اُس نے جھلا کر کہا "کیا کہوں اس دوزخی کو — روتی ہی رہ گئی کہ ببول کو کاٹ کر کچھ حصے پر چھت ڈالے لیتے ہیں اور کوٹھری کے شہتیر بھی صاف کریں گے۔ مگر جاٹ نے ایک نہ مانی۔ لوگ عیش کر رہے

ہیں۔ اور یہاں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔"

"اری — اب کیا میں چھت ڈالنے بیٹھ جاؤں۔" وہ جوان بیٹی کے بیاہ کی بات کہنے ہی لگا تھا کہ پاس لیٹی ہوئی بیٹی کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

"اوہ تم کیا تیر مار رہے ہو۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی قریب آ گئی۔

"اچھا — اچھا — اب آرام سے لیٹ جاؤ — خواہ مخواہ ٹیں ٹیں کر رہی ہو۔ اپنے سے چھوٹے کو دیکھ کر ہی وقت کٹتا ہے۔"

ہاں — بھئی — یہ بات تو چنن کی سچی ہے۔" ساتھ کے نیچے گھر میں کرم سنگھ کی ماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اُمس سے پھر دم گھٹنے لگا۔ جیسے بارش کبھی ہوئی نہیں تھی۔ بی بی عطری کے دالان میں ببول چپ چاپ کھڑا تھا۔ گرمی سے بے بس ہو کر چنن قدرت کے نظام کے خلاف بولا "کوئی کمینہ پہرے پر بیٹھا ہے۔ آج تو پتہ نہیں ہل رہا ہے۔"

"غریب کے لیے مصیبت ہی مصیبت —" نیچے ڈھور ڈنگر والے گھر کے سامنے گلی میں چارپائی بچھائے مینگل بولا — اپنی جگہ پر وہ خود گرمی سے تڑپ رہا تھا۔

"بے بے مچھر کاٹ رہا ہے۔" بھدر چارپائی کی ادوائین سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے بولا۔

بی بی عطری کے ببول کی ٹہنیاں تھوڑی سی ہلنے لگیں۔ ہلکے ہلکے ہوا چلنے لگی جس میں گیلے کوٹھوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ گھندے نے اپنی چارپائی پر آرام کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی — چنن — پہرہ بدل گیا۔ کوئی سخی داتا پہرہ پر آ بیٹھا ہے۔"

"ہاں بیٹا —" دور سے کرم سنگھ کی ماں نے کہا — "دنیا میں نیک بندوں کی کیا کمی ہے۔"

"یہ تو کوئی دھرو ہے دھرو (دھرو بھگت)۔" گھندا چلتی ہوئی ہوا کے جھونکوں کا مزہ لیتے ہوئے بولا — چنن کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اُسے خاموش پڑا دیکھ کر گھندے نے بلند آواز میں کہا — چنن — ابے چنن"

"ہاں —" چنن اونگھ رہا تھا۔

"کیا نیند آ رہی ہے؟"

"ہاں —"

"اچھا تو پھر سو جا۔" گھندے نے خود بھی کروٹ بدل لی۔

ہلکی ہلکی ہوا نے جیسے سارے غم مٹا دئے تھے۔ قدرت اپنے نرم ہاتھوں سے لوریاں دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ سب سو گئے۔ چنن ایک پہلو کے سہارے بازو پر سر رکھ کر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

اچانک ایک بھوکے شیر کی طرح بادل گاؤں پر گرجا۔ چنن ہڑبڑایا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھنے بادل چاند کو آغوش میں لیے ہوئے آسمان پر پھیل گئے۔ ہلکا سا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ چنن اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور پیروں سے جوتی ٹٹولنے لگا۔

چنیوں کے چوبارے پر روشنی کی ایک لکیر سی لرز اُٹھی ـــــ اور پھر تیزی سے بجلی کوندنے لگی ـــ بچے رونے اور کتے بھونکنے لگے۔ چنن کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں ایک پیلی اور ایک سبز لکیر ابھی تک لرز رہی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا بول کی ٹہنیوں میں آ رہا تھا۔

"اسے سانپ سونگھ جائے ـــ" بچنوں چھوٹی لڑکی کو سینے سے لگائے بڑبڑا کر اُٹھی ـــ کمینہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گیا ہے۔ نہ جانے کہاں سے چڑھ آیا ہے" اور اس نے پریشان ہو کر بلند آواز میں چنن سے کہا۔ "اب تم بیٹھے کیا سوچ رہے ہو۔ چارپائیاں تو نیچے اُتارنی ہی پڑیں گی"

"اب نیچے کہاں اُتاریں گے" چنن کے ہاتھ پاؤں دُکھ رہے تھے۔

"اور کیا کریں گے۔ دیکھتے نہیں کہ بادل جھکے ہوئے ہیں۔ جلدی اٹھو"

"ایک گھنٹہ پہلے بادل کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا" گھندا اپنی چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا ہوا رک گئی۔ بادل گہرے اور گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ چینے نمبردار اور دیگر چوباروں والے دروازے اور کھڑکیاں کھول کر آرام سے اپنے چوباروں میں پڑے تھے۔ چنن نے ایک لمحہ کے لیے سوچ کر کہا ـــ میں بچوں کی چارپائیاں چھجوں کے نیچے کھسکا دیتا ہوں۔ تم سیبو کو لے کر نیچے چلی جاؤ۔ میں ابھی یہیں ـــ"

کوئی کوئی بوند گرنے لگی۔

بچنوں پریشانی کے مارے تنک کر بولی "تمہاری تو عقل ہی جاتی رہی ہے۔ کیا بات کر رہے ہو۔ چھجوں کے نیچے ان کو کیوں سلاؤ گے۔ چلو چارپائیاں پکڑاؤ"

"اچھا ـــ" وہ بھاری آواز میں چلایا۔

بچنوں اور سیبو تیزی سے کپڑے لپیٹ کر اور چھوٹے بچوں کو اُٹھا کر نیچے چلی گئیں۔ کولو اور بھندا آدھ سوئے آدھ جاگے سیڑھیوں پر سے اُترنے لگے اور وہ خود پانیتی کی طرف دری اکٹھی کر کے کھڑی چارپائی پر لیٹ گیا بوندیں پڑ رہی تھیں۔

"چنن ـــ آج یہ نہیں سونے دے گا" بوندوں سے تنگ آ کر گھندے نے کہا۔

"ہماری تو زندگی ہی خراب ہے۔ نہ دن کو چین ۔ نہ رات کو نیند" چنن کی آنکھوں میں کنکر کھٹک رہے تھے۔

"مزے تو چوبارے والے اڑاتے ہیں" چنیوں کے چوبارے میں دیئے کی لو دیکھ کر گھندے نے حسد سے کہا۔

"مالک کی قدرت ہے" چنن نے آہ بھری "گھر کی تنگی بُری۔ رات ابھی کتنی باقی ہوگی گھندے؟"

"ابھی تو بہت باقی ہے"

"کہیں بادلوں کی وجہ سے تو یہ اندھیرا نہیں ہے"

"نہیں ۔ ابھی تو رات آدھی گزری ہے ۔ ابھی تو صبح کا تارا بھی نہیں نکلا ۔ بادلوں کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ تمہیں مُنہ اندھیرے جانا ہوگا"

"ہاں"

"تو پھر پڑے رہو ۔ ابھی کافی وقت ہے ۔ آدمی کو کچھ آرام بھی کرنا چاہیے"

"جاٹ کو آرام کہاں ملتا ہے؟"

"تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے" گھندا حامی بھر کے خاموش ہوگیا۔

چھوٹی چھوٹی بوندیں آہستہ آہستہ بکھرنے لگیں۔ گھنے بادل نیچے آکر جھکے رہے اور ہوا کے بے تکے بگولوں نے اُس کا دامن چیتھڑے چیتھڑے کر دیا اور گھندے اور چنن کی باہمی باتیں نیند کے میٹھے میٹھے خمار میں ختم ہوگئیں۔ چنن کی آنکھیں چاہے بند تھیں لیکن اب اس کے دل میں ایک نئی کُھد بُد چھڑی ہوئی تھی "کہیں سوتے میں دن نہ نکل آئے" اس نے سوتے میں اپنے کان گلی کی آہٹ کی طرف لگا دیئے تھے۔

بوندوں کی آواز، جسم کی تکان اور گھندے کی باتوں سے بے خبر وہ ماروُوں کے کھیت کی طرف نکل گیا۔ پَو پھوٹ رہی تھی۔ آس پاس لوگوں کی گھاس نرم نرم ہواؤں میں کانپ رہی تھی۔ موٹھ، ماش، گوار اور مونگ کی فصل نے سر نکال لیا تھا۔ دور ایک ٹیلے پر جیتے نمبردار کا ہل چل رہا تھا۔ بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی آواز پر "مرزے" (مرزا صاحباں کا افسانۂ محبت) کے اشعار کی تان بلند ہوتی جا رہی تھی .....

وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔

منڈیر پر منہ اندھیرے مرغ بانگ دے رہا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے بیلوں کے

گلے میں پڑی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور صبح کاذب کی لَو بادلوں کے پیچھے سے نمودار ہی ہونے والی تھی۔

دالان میں سے بیلوں کو کھول کر چنن ٹیلے کی طرف جاتے ہوئے بولا "بچن کور سیبو کو ناشتہ دے کر جلد بھیج دینا۔ چائے ذرا کڑ دی رہے ....."

اُس وقت اُس کی آواز پھٹے بانس جیسی تھی۔

مہندر سنگھ سرنا

چھویوں کی رُت

دہکتے انگاروں سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی بھٹی پر جھکا ہوا دینے لوہار کا لوہے کے رنگ جیسا بدن کانسی کی طرح دمکنے لگا تھا۔ اُس کا پیکر کانسی میں ڈھلے ہوئے ایک تندرست مزدور کا بُت معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے بازوؤں کے ایک مضبوط جھٹکے سے اپنے گرد ہتھوڑا گھمایا، اس کے بدن کی مچھلیاں اُبھر آئیں اور لوہے پر ٹکے ہوئے سرخ انگارے کی طرح لوہے پر بلا کی ضرب پڑی۔

ضرب لگاتار گونجتی رہی۔ کام کے انہماک میں دِینا دین دُنیا کو بھول گیا اور اس وقت تک بھولا رہا جب تک کہ کھڑکی میں سے آتی ہوئی بھادوں کی چلچلاتی دھوپ اس کی ہڈیوں کو چاٹنے نہ لگی۔ اُس نے چونک کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ سورج اپنے عروج پر تھا۔ اس قدر جلد دوپہر ہو گئی تھی اور اس کا کام ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ دھوپ کی آنچ سے بچنے کے لیے اس نے کھڑکی بند کر دی۔ لیکن کھڑکی بند کر دینے سے اُس کا دم گھٹنے لگا اور اس کے ماتھے پر چپچپاتا ہوا پسینہ آ گیا۔ رات کو بہت بارش ہوئی تھی۔ آسمان سے پانی چھاجوں برستا رہا تھا۔ صبح بھی بوندا باندی ہوتی رہی تھی لیکن اب سورج طلوع ہونے کے بعد بڑا حبس ہو گیا تھا۔ اُس نے کھڑکی کھول دی اور دوبارہ بھٹی پر جھک گیا۔ اب پسینہ اس کے کانوں سے ہوتا ہوا اُس کی گردن پر لکیریں بناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے خوب تنے ہوئے بازو سے اپنے ماتھے پر پسینہ نچوڑا۔ موٹے موٹے قطرے انگیٹھی میں گرے "شوں" کی ایک آواز آئی اور ایک لمحہ کے لیے ایک انگارے کو کچھ آرام ملا۔

دھوپ اور بھٹی کی آنچ نے اس کے بدن کو بہت زیادہ تپا دیا تھا۔ یہ آگ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے خون میں جذب ہو چکی تھی۔ یہ طپش اُس کی ہڈیوں کے گودے کو بھون رہی تھی۔ بھٹی کے تیز اور لپکتے ہوئے شعلے اس کی آنکھوں میں جل اُٹھے۔ اپنے بدن کا ایک ایک رُواں فلیتہ محسوس

ہو رہا تھا۔ اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ابھی کوئی فلیتہ آگ پکڑے گا اور اس کا بدن ایک چٹان کی طرح بھک سے ریزے ریزے ہو جائے گا۔

اچانک اُس نے اپنے ہاتھ روک لیے اور کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ باہر تمام آسمان بھادوں کی چلچلاتی دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی غیر مانوس آنکھیں چُندھیا گئیں۔ جب اس کی بینائی ذرا صاف ہوئی تو اُس نے اپنے سامنے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور پھر اُس رتیلی پگڈنڈی کی طرف دیکھا جو کھیتوں کے درمیان ایک روشن لکیر کی طرح اُفق کو چھُو رہی تھی۔ پگڈنڈی کے دائیں طرف کپاس کے کھیت تھے اور کہیں کہیں گنوں کے کھیت میں پانی چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔ پگڈنڈی کے بائیں طرف جُتے اور سہاگا پھرے کھیت بوائی کے انتظار میں تھے۔ تازہ بارش سے نم آلود زمین کی سوندھی خوشبو اس کی ناک تک پہنچی تو اُسے بہت پیاری لگی اور ایکا یکی وہ بہت مسرور ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کھُلی کھڑکی میں سے باہر کود جائے۔ کھیتوں میں جا کر لوٹ پوٹ ہو جائے اور نم آلود زمین کی مہک اپنے انگ انگ میں بھر لے۔

کھیت اُسے بہت عزیز تھے۔ بوائی اور فصل کی کٹائی کے دنوں میں اس کے لہو میں ایک ترنگ اٹھتی تھی اور اس کا جُثہ پھیلنے لگتا تھا۔ وہ گاؤں کا لوہار تھا لیکن گاؤں میں لوہار کے لیے کام نکلتا ہی کتنا تھا۔ زیادہ عرصہ تک وہ کھیتوں میں جاٹوں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ اُس کے جیسی فصل کی کٹائی سات دیہات میں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک اُس کے ہاتھ درانتی کے لیے تڑپنے لگے۔

درانتیاں — فصل کی کٹائی، چاندنی میں جھومتے ہوئے گنے کے کھیت، میلوں تک سنہری بالیوں کی سرسراہٹ اور دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے گیتوں کی تانیں — وہ بھول گیا کہ اُس کی پیٹھ کے پیچھے جہنم کی طرح جلتی ہوئی بھٹی تھی اور گذشتہ بیس دن سے اُس نے "چھویاں (پنجابی جاٹوں کا خاص ہتھیار) گنڈاسے اور بلّم بنانے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔ وہ چھویوں، اور بلموں کا زمانہ تھا۔ اُس دفعہ فصل کی کٹائی کچھ اس قسم کی ہوئی تھی کہ اس کے دوران گندم کی جگہ گندم بیچنے والے کٹ مرے تھے۔

وہ یہ کیا آفت مول لے بیٹھا تھا۔ یہ کیسی بیگار اُس نے اپنے ذمہ لے لی تھی — اس کے چہرے کے آثار سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نئے نئے قائم ہونے والے پاکستان کے تمام مجاہدوں کے لیے ہتھیار تیار کرنے کی ذمہ داری اس کے سر آ پڑی تھی۔ پاکستان تو قائم ہو چکا تھا۔ لیکن پاکستان کی تکمیل کے لیے پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کا قلع قمع کرنا ضروری تھا اگرچہ ابھی تک یہ بات دِینے کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن ہر کوئی یہی بات کہہ رہا تھا۔ یہ جہاد صرف

اسی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا کہ اُس کی بھٹی جلتی رہے۔ اور چھولیوں، اور بلبوں کی صورت میں وہ موت کی زبان اُگلتی رہے۔

اُس نے مڑکر بھٹی کی طرف دیکھا۔ کوئلوں میں رکھے ہوئے لوہے کے تیز ٹکڑے انگاروں سے زیادہ سُرخ ہو گئے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے نفرت سی ہونے لگی اور اس نے اپنی ایک پسلی کو زور سے دبایا۔ کوئی تیکھی اور تیز چیز اس کی پسلی کو چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اُسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ صبح سے اُس نے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا۔ اور اب بھوک اس کی انتڑیاں جلا رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ سوکھ کر لکڑی بن گئے تھے۔

"بشیر کی ماں!" اُس نے گھر کے اندر جھانکتے ہوئے بلند آواز میں کہا "ذرا جلدی سے پانی دینا۔"

پینتالیس سال کی ایک عورت کانسی کے کٹورے میں پانی ڈال کر لائی۔ اس کی ناک میں نتھ تھی اور کانوں میں چاندی کی بالیاں لہرا رہی تھیں۔ اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو پانی پیتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ وہ صبح سے تین بار اس سے پوچھ چکی تھی کہ وہ کیا اس کے لیے کھانے اور پینے کو کچھ لائے۔ لیکن اُس نے اس کی کوئی بات نہیں سنی تھی اور بھٹی پھونکتی رہی تھی اور اب نہ جانے اُسے کیسے بھوک اور پیاس کا خیال آگیا تھا۔ اس عورت نے بھٹی کی دوزخی آگ کی طرف دیکھا، لوہے کے ٹکڑوں کی طرف دیکھا جو کالے پتھروں کی طرح فرش پر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، اُس نے ایک کونے میں پڑی کلموہنی چھولیوں، اور بلبوں کی طرف دیکھا اور پھر کافی دیر تک اس کی نظریں اپنے شوہر کے چہرے پر جمی رہیں جیسے وہ اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور اسے پہچان نہ رہی ہو۔

دِینا پانی کا کٹورا ایک سانس میں پی گیا۔

"اور....." اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

وہ عورت اور پانی لے آئی اور اُسے پانی پیتا ہوا دیکھنے لگی۔

"بس ــــ" اُس نے کہا۔ اُس کی گردن اور اُس کی پیشانی پر رگیں پھول گئیں۔ اُس کا ہانپنا کم ہو گیا۔ اور عین اُس وقت اس کے چہرے پر ایک خفت اور ایک بے کلی سی نمایاں ہوئی اور اُس نے کہا۔

"میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ تم مجھ سے بولتی کیوں نہیں ہو اور کس طرح دُور ہٹ کر کھڑی ہو۔ جیسے مجھے پلیگ کی گلٹی نکل آئی ہو۔"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور اندر سے کھانا پروس لائی۔

"میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں" دِینے نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا "تم مجھ سے بولتی کیوں نہیں ہو؟ تم نے مُنہ میں گھنگنیاں کیوں ڈال رکھی ہیں؟"

وہ عورت اب بھی خاموش رہی۔

دِینے نے روٹی مروڑ کر منہ میں کچھ نوالے ڈالے۔ اور پھر اُن نوالوں نے اس کے حلق سے نیچے اُترنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے پانی کے کچھ کڑوے گھونٹ پیئے۔ اور روٹیوں کی چنگیر پاؤں سے ایک طرف سرکاتے ہوئے بولا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو تم مجھ سے — بس دیکھے جا رہی ہو جیسے مجھ سے بھوت چمٹ گیا ہو"

"خدا نہ کرے —" عورت بول اٹھی "لیکن مجھے تو یوں ہی محسوس ہوتا ہے"

دِینے کا منہ حیرت سے کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ اُسے یہ اُمید نہیں تھی کہ بشیر کی ماں بول اُٹھے گی اور اتنے دن کی ہٹیلی خاموشی کو آج وہ اچانک توڑ ڈالے گی۔

تھوڑی دیر کے لیے حیرت نے اُسے سنبھلنے نہ دیا۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کیا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ تمہارے بیٹے ہی مجھے جینے نہیں دیتے ہیں۔ ابھی بشیر یہ کہہ گیا ہے کہ کل شام تک پچاس چھویاں تیار ملنی چاہئیں اگر میں ذرا سا بھی چوک گیا تو وہ میری جان کو آجائے گا۔ تم کہتی تو ہو یہ اور وہ — اور میں کہتا ہوں کہ اگر میں نے ذرا سا بھی انکار کیا تو وہ میرے ٹکڑے اُڑا دیں گے۔ میرا خون پی جائیں گے"

"وہ بیٹے تمہارے ہیں یا کسی اور کے؟" بشیر کی ماں نے پوچھا اور پھر دل ہی دل میں وہ اپنے اس سوال پر شرمندہ ہو گئی۔

"میرے ہی ہیں" دِینے نے احمقوں کی طرح کہا۔

"پھر ان کو تم سے ڈرنا چاہیے یا تمہیں اُن سے؟"

"تمہارے لیے باتیں بنانا بہت آسان ہے" وہ بولا "کیا تم اپنے بیٹوں کو جانتی نہیں ہو کہ وہ کیسے مُسٹنڈے ہیں۔ میری کیا مجال کے میں ان کے آگے اپنے کان بھی ہلا سکوں۔ وہ تو میری کھال اُدھیڑ دیں"

"بیٹے تو وہ میرے بھی ہیں" اس عورت کے لب و لہجہ میں کچھ نرمی پیدا ہو گئی تھی "تم دیکھتے ہو کہ وہ کیسے ہر وقت مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کیسے بات بات میں مجھ پر جھپٹتے ہیں لیکن میں ان کے لیے چھویاں تیار نہیں کرتی ہوں"

"پھر کیا ہوا؟" اُس نے کہا۔ "میں صرف چھویاں بناتا ہوں۔ لوگوں کا گلا تو نہیں کاٹتا۔"
"یہ گلا کاٹنے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔" عورت بولی "قاتل ایک دو یا پچاس کا گلا کاٹتا ہے لیکن تمہارے ہاتھ کی تیار کی ہوئی چھوی کئی بیسی بے گناہوں کو کاٹتی ہے۔"

ایک کپکپی سی دِینے کے تمام جسم میں سے گزر گئی۔ اور پھر اُس کا رواں رواں کانپنے لگا۔ کافی دیر تک وہ کچھ بول نہ سکا۔ جب اس کے منہ میں آواز پیدا ہوئی تو اُس نے کہا۔

"مجھ سے کہتی ہو — لیکن بیٹوں کو منع نہیں کرتی ہو جو سپہ سالار بنے پھرتے ہیں ایک ایک رات میں دو دو گاؤں خاک سیاہ کر دیتے ہیں۔"

"وہ میری سنتے ہیں اور کیا تم سنتے ہو؟" عورت کا لب و لہجہ اب اور بھی نرم پڑ گیا تھا۔ "میں بھلا کسی سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہر کسی کو اپنے اپنے گناہ کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی سے کچھ کہوں۔"

کچھ دیر کے لیے وہ چپ چاپ فرش کی طرف دیکھتے رہے۔

اچانک عورت بولی "تم روٹی کیوں نہیں کھا رہے ہو؟ کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے؟"
اُس نے روٹیوں کی چنگیر کھینچ کر دینے کے آگے رکھ دی۔

باہر کے دروازے پر ہلکی سی آہٹ نے دِینے کو چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ بشیر یا اس کے ساتھیوں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ہاں وہ اسے یاد دلانے آئے تھے۔ دروازے کی کنڈی پر پڑا ہوا اس کا ہاتھ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اُس نے بھٹی کی طرف دیکھا۔ وہ دہک رہی تھی۔ ہر چیز ٹھیک اور اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اُس نے کنڈی کھول دی۔ ساون بھادوں کی بارشوں سے نم آلود دروازہ چرچرایا۔

دِینا گھبرا کر اندر کی طرف دوڑا اور بھٹی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اُس کی بیوی کا رنگ سفید پڑ گیا۔ اور اس کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ دروازے میں مندر کی بوڑھی برہمن عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہلدی جیسے زرد رنگ پر جھرّیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور اُس کا سفید بالوں سے اٹا ہوا سر کانپ رہا تھا۔ دِینا اور اُس کی بیوی خوفزدہ آنکھوں سے اُس بڑھیا کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ بالکل ویسی تھی جیسی اپنے زندہ ہونے کے دوران ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب تو وہ بھوت بن چکی تھی۔

آخر دِینے کی بیوی نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"چاچی کیا تم ابھی تک زندہ ہو؟"

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس وقت دینے کی بیوی کو یاد آیا کہ برہمن عورت بہری تھی۔ شاید مرنے کے بعد بھی اس کا بہرا پن ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس نے بڑھیا کے اور نزدیک جا کر بلند آواز میں اپنی بات دوہرائی۔

بڑھیا کی آنکھوں میں شعور کی چمک پیدا ہوئی اور بولی "کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ سات دن تک مجھے میعادی بخار آتا رہا۔ میں اندر کوٹھڑی میں پڑی رہی۔ اکیلی بخار میں بھنتی رہی۔ کسی نے مجھے پانی کا ایک گھونٹ تک نہ پلایا۔ تلسی کو باہر گئے ہوئے کتنے ہی دن ہو چکے ہیں۔ چاہے میں اُس کے پیچھے بیت ہی جاتی۔ آدمی کا ہے کیا۔ آج میرا بخار اتر گیا ہے۔ مجھ سے اُٹھ کر کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا لیکن میں نے دل کی ڈھارس بندھائی اور یہاں تک چلی آئی ہوں۔ لیکن تم دونوں اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟"

بولنے سے وہ بڑھیا پسینے میں نہا گئی۔ اس کے دم میں دم نہیں آ رہا تھا۔ اپنی کنپٹیوں کو دباتی ہوئی وہ اپنے پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے حس ہوئی جا رہی تھیں اور اُس کا ہر سانس آخری سانس معلوم ہوتا تھا۔ ایک انوکھے اطمینان سے دینے اور اُس کی بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ برہمن عورت ہی تھی اور میعادی بخار نے اُسے اُس ہونی سے بچا لیا تھا جو گاؤں کے لوگوں پر گزر چکی تھی۔ اس کے بہرے پن نے اس کے کانوں میں اُس مصیبت کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی جو پرسوں جمعرات کو اس گاؤں میں ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ ابھی تک یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا گاؤں پاکستان میں آ گیا تھا۔ وہ ابھی تک یہ نہیں جانتی تھی کہ پاکستان اس کے گاؤں میں چلا آیا تھا اور گاؤں کے ہندوؤں اور سکھوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ چھوٹی لڑکیاں فسادیوں نے سنبھال لی تھیں۔

اچانک وہ برہمن عورت بولی "اے دِینے — تو نے کہیں میری بکری تو نہیں دیکھی؟"

بکری — دِینا سوچنے لگا کہ ان دنوں جب فسادیوں کے ہجوم مویشیوں کو اُن کے بچھڑوں اور بچھڑیوں کے ہمراہ ہڑپ کر چکے ہیں تو برہمنی کی بکری کس گنتی میں تھی۔

دِینا بولا — "مائی — تیری بکری کہیں بھی نہیں ہے۔ لوگ اسے کھا پی چکے ہیں"۔ لیکن بڑھیا کو کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ اپنی بات بلند آواز میں دہرانے ہی لگا تھا کہ اُس کی بیوی نے اشارے سے منع کر دیا۔

"دیکھو نا" برہمنی بولی — یہ زنجیر مجھے مندر کی دہلیز پر ملی ہے۔ نہ جانے سُسری نے زنجیر

کیسے توڑلی۔ ذرا دیکھو تو سہی — وہ چھلا ہی کاٹ دیا گیا ہے جس میں کنڈی پھنسائی جاتی ہے۔ میں نے سوچا چل کر دینے سے جا کر کہوں کہ وہ اس زنجیر کو جوڑ دے۔"

دینے نے دیکھا کہ بڑھیا نے اپنے ہاتھ میں بکری کو باندھنے والی زنجیر تھام رکھی تھی جو بیچ میں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ بکری کی گردن پر کسی تیز دھار والے ہتھیار کے وار نے زنجیر کے بھی ٹکڑے کر دئے تھے۔

دینے کی بیوی دیر سے بڑھیا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ آخر اس کے خیالوں کے خاتمہ پر ایک کھڑکی سی اُسے کھلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بولی "چاچی۔ تم ہمارے یہاں رہ جاؤ۔ تم مندر میں اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ اور آج تو تمہارا بخار اترا ہے۔ یہیں کھانا بنا لینا اپنے برتن لے آؤ — تم جنم کی ہندو جو ہو۔ تلسی باہر سے آجائے تو پھر چلی جانا۔"

برہمنی کچھ زیادہ ہی بہری ہوگئی تھی۔ شاید معیادی بخار نے اُس کے کانوں پر کھپرے چڑھا دئے تھے۔ اتنی لمبی بات میں سے وہ صرف تلسی کا نام سُن پائی۔

"میں تمہیں بتا تو چکی ہوں کہ تلسی باہر گیا ہوا ہے۔ رامے شاہ کی بیٹی کا شگن لے کر نئے چک اُس کے سمدھیوں کے گھر گیا ہے۔ اسارڑھ کی پہلی تاریخ کو پرتیو کے بیاہ کا ساہا نکلا ہے۔ میں نے شاہ سے کہا ہے کہ وہ اس دفعہ ایک گائے مجھے دان میں دیدے۔ اور شاہوں کے گھر شادی آئے دن تو ہوتی نہیں ہے — اور تم خود سیانی ہو — تلسی کا مزاج خشک ہے۔ گھر میں دودھ اور دہی کی بہار رہے گی۔" بڑھیا کی بات اَن سنی کرتے ہوئے دینے کی بیوی دِنے کی نظروں کا مفہوم بھانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کچھ مشورہ کرنا چاہتی تھی لیکن دینا اس کے بولنے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کیا ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے بس کی نہیں۔ مجھے تو کوئی عذر نہیں لیکن اس کو کس جگہ چھپا کر رکھیں گے۔ ابھی وہ تیری کوکھ سے نکلے ہوئے مانس گندھ مانس گندھ کرتے ہوئے آجائیں گے۔"

اور تم جانتی ہو کہ اُن سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ ان کو پتہ لگ جائے گا تو ہماری وہ شامت آجائے گی جیسی کسی کی نہ آئی ہو۔"

"بوڑھی جان ہے۔" دینے کی بیوی نے التجا کی "ہمارے گاؤں کے کھتریوں کی واحد نشانی ہے۔ برہمنی اللہ کا نام لینے والی ہے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ اس کا بیٹا واپس آجائے گا۔ پھر ان کو کسی اور گاؤں میں بھیج دیں گے۔"

"کس گاؤں میں بھیج دیں گے؟" دینے نے چلا کر کہا "کون سا ایسا گاؤں ہے جہاں یہ بچی رہے گی۔

اور رہا اس کا بیٹا۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ وہ اس دفعہ ایسی جگہ گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ نئے چک کے سب کھتری مارے گئے ہیں۔ ان کا بیج ناس ہو گیا ہے۔"

عورت کا مُنہ اُتر گیا۔ اُس نے کانپتی ہوئی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ لی اور بولی "کیا تم سے دھیمی آواز میں نہیں بولا جاتا۔ کیا تم اسے سنا کر ہی رہو گے کہ اس کا بیٹا مارا گیا ہے۔"

ابھی تک انھوں نے زیادہ باتیں سرگوشیوں کے انداز میں کی تھیں مگر وہ سرگوشیاں بلند تھیں خیر وہ چاہے کتنی ہی بلند آواز میں باتیں کرتے بڑھیا ان کو سُن نہیں سکتی تھی۔

بڑھیا نے اپنی بخار زدہ آنکھیں اُن دونوں کے چہروں پر گاڑ دیں اور جھلّا کر بولی "تم دونوں نے کیا کھُسر پھُسر لگا رکھی ہے۔ دِینے — تو میری طرف تو دیکھتا ہی نہیں۔ ذرا یہ زنجیر جوڑ دینا۔ یہ بھی کیا بہت بڑا کام ہے؟"

"مائی کل آنا" دینے نے اپنا منہ بڑھیا کے کان کے قریب لے جا کر کہا "آج مجھے فرصت نہیں۔ اب تم گھر جاؤ۔"

"اچھا —" گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتے ہوئے بڑھیا کراہی "چلو — تو کل کہتا ہے تو کل ہی سہی۔ لیکن میری بکری کا خیال رکھنا۔ میں کہہ چلی ہوں۔ اگر دکھائی دے تو باندھ کر رکھنا۔ نہ جانے کو کھ جلی کہاں کہاں گھومتی ہو گی۔"

اس سے پہلے کہ دِینے کی بیوی اُسے روکتی لڑکھڑاتی ہوئی بڑھیا باہر گلی میں نکل گئی۔

اُس بڑھیا نے کتنا وقت ضائع کر دیا تھا۔ کام کا ہرجا ہوا تھا اور دینے کو یہ بات بُری لگ رہی تھی۔ اتنے میں وہ پانچ چھویاں تیار کر سکتا تھا۔ بشیر یہ تو پوچھے گا نہیں کہ وہ کس سے دماغ سوزی کرتا رہا تھا۔ وہ پوری پچاس چھویاں گِن کر رکھوالے گا۔

اُس نے کام میں مشغول ہونے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا کر نہ سکا۔ اس کے دل میں ایک کسک سی تھی۔ کانپتے ہوئے سفید بالوں کی لٹوں کے پیچھے بخار سے تھرتی ہوئی آنکھوں کی یاد بار بار اس کے دل میں چلی آتی تھی۔ آگ کے دو موٹے شعلوں کی طرح وہ آنکھیں اس کے دماغ میں دھنستی چلی جا رہی تھیں۔

سب سے زیادہ جو بات اسے مضطرب کر رہی تھی وہ اُس بڑھیا کی لاعلمی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ تلسی اب لوٹ کر نہیں آئے گا اور نہ پرتیو کے بیاہ کا ساہا اب پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ پرتیو پر تو بشیر نے اس کے باپ کی حویلی سمیت قبضہ کر لیا تھا۔

یہ بات بشیر نے بہت بُری کی تھی۔ بہو بیٹیوں کی عزّت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ پرائی بیٹیوں

کی عزت اپنی بیٹیوں جیسی ہوتی ہے۔ کون ایسا ہے جو اپنی بیٹی کی بے عزتی کو برداشت کر سکتا ہے؟

اچانک ایک بھیانک منظر دینے کے ذہن میں اُبھر آیا۔ پرتیو ڈھائیں مار مار کر اپنے باپ کی لاش سے چمٹی رہی تھی اور بشیر اس کو اس کی زلف سے گھسیٹتا ہوا لے آیا تھا۔ ڈھائیں مارتی، واسطے دیتی پرتیو اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ اور پھر اچانک وہ خاموش ہو گئی جیسے ذبح ہونے سے پہلے بھیڑ خاموش ہو جاتی ہے۔

اور وہ — بشیر کا باپ دروازے میں چپ چاپ کھڑا یہ جہنم آفرین منظر دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے بشیر کو روکا نہیں تھا۔ اس کو گردن سے پکڑ کر زمین پر نہیں پٹکا تھا۔ اپنی بیٹی کی عزت بچانے کے لیے اُس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

پرتیو کے زرد اور معصوم چہرے کے پرتو دینے کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور اس کی ڈھائیں اور کراہیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایکا ایکی وہ کپکپا اُٹھا۔ اس کے بدن میں شدید کپکپی چھڑ گئی۔ ایسی کپکپی کہ وہ ٹھنڈی موت کا پیغام معلوم ہوتی تھی۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کپکپی کو روکنے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ وہ بھٹی میں دہکتے ہوئے لوہے کے ٹکڑے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لے۔ لیکن اس کا سر جل رہا تھا۔ ساری کی ساری بھٹی اس کے سر میں گر گئی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبایا۔ اُس کی ہتھیلیاں آنچ سے جھلس گئیں۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ کچھ کر بیٹھے گا۔ اُسے وہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ دور۔ ان سب باتوں سے بہت دور — اُس نے بے خیالی میں کھڑکی کھول دی اور باہر کود گیا۔ بڑی دیر تک وہ بے تحاشا کھیتوں میں گھومتا رہا۔ سہ پہر شام میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُفق پر کسی نے سورج کو قتل کر دیا تھا۔ معصوموں کے خون سے تمام آسمان رنگا گیا تھا۔ وہ لہوندی نالوں کے پانی میں بھی گھل رہا تھا۔ وہ گنا کون چوسے گا جس پر لہو کے چھینٹے تھے۔ وہ کپاس کون استعمال کرے گا جس کی سینچائی خون سے ہوئی تھی۔ اور لہو سے سیراب ان کھیتوں میں کیسی گندم اُگے گی۔

چاروں طرف لہو کا چھڑکاؤ اُس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چھویوں سے کیا گیا تھا۔ یہ گوشت اور ہڈیوں کی فصل اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے گنڈاسوں اور بلموں سے بچی گئی تھی اور جو دو چار بچ رہے تھے ان کے لیے وہ چھویاں بنا چکا تھا۔ کل رات تک ان کا بھی صفایا کر دیا جائے گا۔

وہ گنا ہگار تھا — بھاری گنا ہگار تھا — بشیر کی ماں نے سچ ہی کہا تھا — اُسے کم سے کم نئی چھویاں بشیر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ نہیں لگنے دینی چاہئیں۔ ایسا کرنے سے اس کے گناہوں کا کفارہ ادا

ہونے سے رہا لیکن اب وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ بے تحاشا گاؤں کی طرف دوڑا — بشیر کے آدمیوں کے پہنچنے سے پہلے وہ گھر پہنچنا چاہتا تھا وہ چھویوں کو کسی کنوئیں یا خندق میں پھینک دینا چاہتا تھا جہاں سے ان کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔

جب وہ گاؤں کے قریب پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ ڈھلتے چاند کی دھندلی روشنی گلی میں مکانوں کی دھندلی پرچھائیاں ڈال رہی تھی رات کی بارش سے گلی میں کیچڑ ہو گئی۔ اس کے پاؤں بار بار کیچڑ میں پھنس جاتے تھے لیکن وہ آگے بڑھتا رہا چانک وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر اسے آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اس کے گھر سے ہی آ رہی تھیں۔ کیا وہ آ پہنچے تھے؟ وہ دیر سے پہنچا تھا۔ بشیر کی لغو اور بے ہودہ ہنسی صاف سنائی دے رہی تھی۔

گھر کے باہر کسی بھاری چیز سے اس کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ کوئی ٹھنڈی یخ چیز اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں چھڑانے کا جتن کیا لیکن وہ اور بھی زیادہ جکڑے گئے۔ ایکا ایکی وہ بہت گھبرا گیا۔ ایک خوفناک وہم اس کے دل میں سرایت کر گیا اور اسے ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ اپنے جسم کے پُرزور جھٹکے سے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چاندنی میں بالوں کی کچھ زرد لٹیں ہل رہی تھیں۔ چھوی کا ایک لمبا زخم اس بڑھیا کے ماتھے پر تھا اور اس کی ٹیڑھی اور پتھرائی ہوئی آنکھیں اسے پھٹکار رہی تھیں۔ اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ بڑھیا کے بازوؤں میں الجھی ہوئی زنجیر نے اس کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔

اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس رات اسے شدید بخار ہو گیا۔ رات بھر وہ چارپائی پر گز گز بھر اچھلتا رہا۔ رات بھر اس کے بڑبڑانے کی آواز گاؤں کی سنسان خاموشی میں گونجتی رہی "مجھے نہ مارو — مجھے چھویاں نہ مارو۔ یہ زنجیر میری گردن پر سے اتار دو — اوہ میری بیٹی — میری بیٹی کو کچھ نہ کہو — پرتیو کو کچھ نہ کہو — آہ یہ زنجیریں — خدا کے واسطے مجھے چھویاں نہ مارو — نہ مارو —!"

نوتیج سنگھ

قسمت کی ڈور

سارا گاؤں کراماتی اور تجسولی سادھو کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ اُن کے گاؤں میں قدم رکھے اور مویشیوں پر آکر جادو ٹونا کرے۔ تیجو مذہبی (چھوٹی ذات کا) کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قسمت کی باگ ڈور ہی اُس سادھو کے ہاتھ میں ہو۔ کھیتوں کے مالکوں کی فصلوں پر بور آگیا تھا اور وہ شگوفوں سے مزیّن ہوگئی تھیں۔

کوئی اپنے گنّے کے کھیت میں گوڑائی کرتا ہوا آیا تھا اور کوئی اپنے دھان کے کھیت سے گھاس پھوس نکال رہا تھا۔ لیکن تیجو کے پاس تو صرف ایک بلّو ہی تھی۔

گاؤں میں ہر روز چند مویشی اپنے کان ڈھیلے چھوڑنے لگے تھے۔ وہ چارے میں منہ مارنا چھوڑ دیتے۔ ان کی آنکھیں گیدے سے بھر جاتیں اور پھر تھوڑے عرصہ کے بعد اپنا گلا پھاڑ دیتے۔ ان کے منہ سے جھاگ بہنے لگتی۔ بڑی مشکل سے سانس لیتے جیسے اُن کا گلا جکڑ گیا ہو۔ لوگوں نے بہت جوڑ توڑ کئے لیکن اُن کا کوئی بس نہ چلا۔ گاؤں کے کئی مویشی مر چکے تھے۔

گھور اندھیر تو یہ تھا کہ نوعمر اور اعلیٰ قسم کے مویشی ہی اس مصیبت میں مبتلا ہوتے تھے اور جو ریوڑ میں سب سے زیادہ حسین اور دل کش معلوم ہوتے تھے ان پر ہی یہ آفت نازل ہوئی تھی۔

گاؤں کے کچھ لوگوں نے کہا تھا۔ سادھو کو چھوڑو — اس دفعہ بلاک والوں کو درخواست دے کر سب مویشیوں کے ٹیکے لگوا دو۔

بزرگوں نے یہ مشورہ بالکل قبول نہ کیا "ٹیکوں سے کچھ نہیں ہوگا"

"تم جانتے ہو کہ سرکاری کام کچھوے کی چال سے ہوتے ہیں"

"پہلے سارے گاؤں کے دستخط کراؤ گے اور پھر درخواستیں دیتے پھرو گے"

"کتنے ہی دن درخواست دفتروں کے چکّر کاٹے گی اور پھر اس کے بعد شاید مویشیوں کا ڈاکٹر

سر ہلا کر کہہ دے "ٹیکے تو ہیں ہی نہیں"۔

آخر کار جن لوگوں نے ٹیکوں کے حق میں آواز بلند کی تھی وہ بھی سادھو کا سہارا لینے کی بات مان گئے۔ وہ بڑا چمتکاری اور کرنی والا تھا۔ اب تو وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن جب وہ بھرپور جوان تھا تو کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اُس کے ڈیرے میں آنے والی نوجوان عورت کے سلسلے میں اُس پر الزام آ گیا تھا۔ سادھو نے یہ بے بنیاد الزام سنتے ہی اپنا عضوِ تناسل کاٹ دیا تھا...

آج گاؤں کے اگوا اس سادھو کو لانے کے لیے گئے ہوئے تھے۔

پہلے لوگ بڑی لاپروائی کے ساتھ اپنے ڈھور ڈنگروں سے کہہ دیا کرتے تھے "تجھے بن آئی آجائے!" لیکن اب کچھ دنوں سے کوئی یوں نہیں کہتا تھا۔

تیجو مذہبی نے تو اپنی بھینس کو پہلے بھی کبھی گالی نہیں دی تھی۔ اُس نے چھوٹی سی بچھڑی سے اپنی بلو کو اتنا بڑا کیا تھا۔ جب وہ روٹی کھانے بیٹھتا تو اس کی بلو چوترے کے قریب چلی آتی تھی۔ اُس نے اس کو نوالے دے دے کر بیٹیوں کی طرح پالا تھا۔ بلو جہاں بھی ہوتی اُسے دیکھ کر ڈکرانے لگتی۔ جیسے بلو کو یہ معلوم ہو کہ چیتے شاہ تیجو کو قرضہ ادا کرنے کے لیے دھونس دے رہا ہو۔ اُس نے ساڑھے تین ہی برس میں بچہ جن دیا تھا۔

چیتے شاہ نے بہتیرا زور لگایا تھا کہ تیجو اُسے بلو دیدے اور سارا کھاتہ کٹوا لے لیکن تیجو نے جوں ہی بلو نے بچے کو جنم دیا ذیلو دودھ والے سے سو روپیہ پیشگی لے کر چیتے شاہ کی ایک قسط ادا کر دی اور اُسے اُمید تھی کہ وہ اپنا سارا بوجھ اُتار ڈالے گا۔

لیکن اب گاؤں میں کسی کی کٹڑی مر گئی اور اس کی بھینس دودھ نہیں دیتی تھی۔ اور کسی کی بھینس ہی بیمار ہو گئی تھی۔ تیجو جی ہی جی میں بہت ڈر رہا تھا۔ اُسے چمتکاری سادھو پر بہت اعتقاد تھا۔

جو لوگ سادھو کو لانے کے لیے گئے تھے وہ شام ڈھلے واپس آ گئے۔ ایک سادھو اُن کے ساتھ آیا۔ مگر وہ چمتکاری سادھو نہیں تھا۔ اس کا بڑا چیلا تھا۔ چمتکاری سادھو کو ان سے پہلے کسی اور گاؤں کے لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

گاؤں میں کنستر بجا دیا گیا۔

"بھائیو — ڈھور ڈنگروں کی مصیبت دُور کرنے کے لیے سادھو مہاراج آ گئے ہیں۔ پنچایت کا حکم ہے۔ رات کے دس بجے سے صبح تک یعنی جب تک کہ سارے گاؤں کے ڈھور ڈنگر سامنے سے گزر نہیں جاتے تب تک نہ کوئی دِیا جلائے، نہ آگ جلائے، نہ کنوئیں میں سے پانی

نکالے، نہ نل چلائے اور نہ گائے بھینس دوہے۔ گاؤں سے باہر کوئی نہ جائے اور نہ کوئی گاؤں کے اندر آئے۔ جو کوئی بھی اس اصول کی خلاف ورزی کرے گا وہ گاؤں کے سامنے جواب دہ ہوگا اس کا منہ کالا کر کے اُسے گدھے پر سوار کیا جائے گا۔ اور پچاس روپے جرمانہ بھی کیا جائے گا۔"

سادھو نے چیتے شاہ کی دوکان سے آدھا گز لال ڈورا، ناریل اور سامگری کا ڈبہ لیا اور شاہ نے ہی دو سیر دیسی گھی کا بھی انتظام کر دیا۔ یہ سارا سودا پانچ روپے کا بن گیا لیکن چیتے شاہ نے خندہ پیشانی سے یہ سارا سامان اُدھار دے دیا۔ صبح سادھو کے پاس گندم کے انبار لگے ہوں گے۔

سادھو نے ایک کورا گھڑا منگوایا۔ اور اس کے پیندے میں ایک چھید کر دیا۔ پھر ایک بالٹی میں منتروں کا جاپ کرنے کے بعد دودھ اور پانی ڈالا۔ گھڑا پکڑنے کے لیے چار پانچ نوجوانوں نے سادھو کا ساتھ دیا۔ سادھو نے پوتر پانی اور دودھ بالٹی میں سے نکال کر گھڑے میں ڈال دیا اور وہ گھڑا گاؤں کے گرد گھما کر ایک لکیر سی کھینچ دی۔

اس لکیر کے پار کوئی جا نہیں سکتا تھا۔ اور کوئی باہر سے اس لکیر کے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے اندر جتنے بھوت تھے اور چڑیلیں تھیں ان کو سادھو صبح تک اپنے جادو ٹونے سے ختم کر دے گا باہر سے کوئی بھوت یا کوئی چڑیل اس لکیر کو پھلانگ کر اندر نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص لکیر پار کر کے اندر چلا آئے گا تو یہ خدشہ تھا کہ بھوت یا چڑیل بھی اس کے ساتھ اندر آ جائے گی۔ آج رات سینچائی کے لیے جس کسی کی بھی باری تھی وہ پہلے ہی گاؤں سے باہر چلا گیا تھا۔

سادھو نے ہون کنڈ روشن کر دیا۔ وہ منتروں کا جاپ کرتا اور ساتھ ہی ساتھ دیسی گھی اور سامگری آگ کی نذر کیے جاتا۔ گاؤں کے گرنتھی اور پنڈت سادھو کے گرد بیٹھے پاٹھ کر رہے تھے۔ گرنتھیوں کو "جپ جی صاحب" کا ایک سو ایک بار پاٹھ کرنا تھا۔

بے باک اور دلیر اشخاص کی ٹولیاں بنائی گئیں۔ ہر ٹولی نے ایک ایک ناند اُٹھالی اور سادھو نے ہون کنڈ میں سے کچھ انگارے لیے اور ناند میں ڈال دیے اور ان پر سامگری بکھیر دی۔ یہ مہکتا ناندے کر وہ ٹولیاں گاؤں کے گلی محلوں میں بکھر گئیں۔

سب نے دروازے پہلے ہی کھلے رکھے تھے۔ اگر اکا دکا کوئی دروازہ بند ہوتا تو وہ اُسے کھلوا لیتے اور ہر گھر اور ہر گلی کو دھونی دیتے ہوئے آگے نکل جاتے اور ساتھ ہی ساتھ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کی ٹوہ میں بھی رہتے۔

سب نے یہ ہدایت کی تھی کہ بشیر چمار کی نگرانی کی جائے۔ مویشی مریں تو اس کو فائدہ ہوتا ہے

جب دُھونی دینے والے چمار کے گھر کے نزدیک پہنچے تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس کے دونوں دروازے کھلے تھے۔ "بھائیو — آپ جب چاہیں اپنا شک دور کر سکتے ہیں۔ میں گاؤں کا غدار نہیں ہوں۔"

اُدھر ہون یگیہ اور پاٹھ رات بھر جاری رہا۔ اور ادھر یہ ٹولیاں رات بھر گاؤں کے گھر گھر کا چکر کاٹتی رہیں۔ صبح سویرے یہ دونوں کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔

صبح سویرے سادھو نے آخری پرارتھنا کی اور ڈھور ڈنگروں کو گذارنے کا وقت آ گیا۔

سادھو کے سامنے دودھ اور پانی سے بھری ہوئی ایک بہت بڑی کڑاہی رکھی تھی۔ جس بڑے موڑ سے گاؤں کے ڈھور ڈنگروں کو گزر کر یہاں پہنچنا تھا۔ وہاں گلی کے آر پار بیس کوری چپنیاں رسّی سے باندھ دی گئی تھیں۔

ہر کسی کو جلدی تھی کہ اُس کے ڈھور ڈنگر جُھگت جائیں اور وہ فراغت پالے۔ ماتھے پر سفید داغ والی بھنیس، بھوری آنکھوں والی بھینس اور پنج کلیانیاں گزر گئیں۔ چاروں طرف کائیں کائیں مچ گئی۔ کچھ دیر تک کسی کو اپنی بھینس نہ ملی۔ کسی کی کٹڑی گم گئی۔ چاروں طرف دھُول ہی دھُول۔

ہر خاندان کا ایک فرد لوٹا اور دودھ بلونے والی چرخی اور نی مولشی ایک پاؤ گندم کے دانے اپنی گرہ میں باندھ کر لایا تھا۔

جب مولشی سادھو کے قریب پہنچتے تو وہ اور اس کے رات کے ساتھی گرنتھی اور پنڈت کڑاہی کے پانی میں کوزہ ڈبو کر مولشیوں پر چھڑکتے۔ ان میں سے ایک ہر کسی کے لوٹے میں وہ پوتر جل ڈالتا چلا جاتا۔ یہ پوتر جل لے کر وہ اپنی گرہ میں بندھی ہوئی گندم ایک ڈھیر کے اوپر پھینک جاتا۔

یہ ڈھیر درمیانے کسان کے کھلیان جتنا ہوا جا رہا تھا۔ جب سارے گاؤں کے مولشی جُھگت گئے تب کہیں جا کر گھروں میں آگ جلی، دہی بلویا گیا۔ اور کنوؤں کی پھرکیاں چلیں۔ اس سے پہلے صرف سادھو کی جگہ پر میلہ لگا ہوا تھا باقی سارے گاؤں میں جیسے کوئی دیو پھر گیا تھا۔

سادھو کے لیے تیس من گندم ہو گئی۔ دو من گندم اُس نے چیتے شاہ سے لیے ہوئے میدے اور گھی کے عوض میں اُسے دیدی۔ باقی گندم ساتھ لے جانے کے لیے اُس نے دو ٹھیلے کرایہ پر لے لیے اور وہ اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔

ایک لوٹی ہر نامے مہرے کو پکڑ لائی۔ اُس پر اصول کی خلاف ورزی کرنے کا الزام تھا۔ ابھی تمام مولشی نہیں گزرے تھے کہ اُس نے غسل کر لیا تھا۔

"نہیں — یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں اپنی بھینس گزارنے کے بعد نہایا تھا — آپ سادھو

سے پوچھ لیں۔"

"سادھو کے چلے جانے کے بعد تم یہ بہانے بنا رہے ہو۔"

"سادھو کو کیا خبر — اس کے قریب سے ہزاروں مویشی اور آدمی گزر رہے ہیں وہ کسے پہچانے گا اور کسے نہیں۔"

"اچھا ہم نے یہ مان لیا کہ تمہاری بھینس گزر چکی تھی اور اس کے بعد تم نے غسل کیا۔ کیا اُس وقت گاؤں کے تمام مویشی گزر چکے تھے؟"

ہرنامے کو کوئی جواب نہ سُوجھا۔

ایک گدھا لایا گیا اور اس پر پالان ڈال دی گئی۔ کوئی دوڑ کر گھر سے توے کی کالک لے آیا۔ ابھی وہ ہرنامے ہرے کو گدھے پر بٹھا کر دو ہی چکر کاٹنے پائے تھے کہ ایک اور ٹولی دوڑتی ہوئی آئی۔

"ذرا یہاں دم لو۔ ایک موٹی مرغی پھنسی ہے۔"

"رام سندر نے رات دیا جلایا تھا۔"

"دیا نہیں — بجلی کا بلب۔"

رام سندر گاؤں کا داماد بھائی تھا — اور وہیں اُس نے پنساری کی دوکان کھول لی تھی۔ وہ ایک شریف اور تعلیمافتہ شخص تھا۔ وہ کانگرسی تھا اس لیے کچھ جاٹ اُسے سرکار کا پٹھو سمجھتے تھے اور اس سے کدر رکھتے تھے۔ وہ کھدر کے سفید کپڑے پہن کر کہیں جا رہا تھا کہ بنتے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

رام سندر پسینے میں شرابور سب کے سامنے کھڑا تھا۔ "مجھے گدھے پر نہ بٹھاؤ۔ اور جتنا جرمانہ چاہو کر لو۔" اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دس دس کے پانچ نوٹ گننے لگا۔

"کیوں — گدھے پر کیوں نہ بٹھائیں۔ تم رانی خاں کے سالے تو نہیں ہو۔"

اس کے اردگرد ایک بھیڑ لگ گئی۔ جن لوگوں کے مویشی مرے تھے وہ بہت برافروختہ تھے۔

"غضب ہو گیا — گاؤں میں اتحاد ہی نہیں رہا۔"

"یہ تو جیتے جی مر گئے۔"

"جبھی تو بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔"

"بھکاری برہمنوں اور ان کتے مہروں نے تو اندھیر گردی مچا رکھی ہے۔ ہزار ہزار کی بھینسیں مرگئی ہیں لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔"

گاؤں کے لڑکے کبھی گدھے اور کبھی رام سندر کو شکارنے لگے۔ بھیڑ میں کوئی اُسے یوں ہی کہنی مار دیتا۔

دو بزرگ بچ بچاؤ لیے بنے "لڑکو۔۔ یہ گاؤں کا داماد ہے۔ اسے معاف کردو۔"

"کیوں۔۔ گاؤں کا داماد۔۔ داماد ہوگا لبھائے برہمن کا۔۔ ہمارا تو یہ کچھ نہیں لگتا۔"

"ہاں۔۔ سالا لگتا ہے۔"

"پچاس کی جگہ نوٹوں سے مٹھی بھر لو لیکن گدھے پر نہ چڑھاؤ۔"

"کیا ہرناما آدمی نہیں تھا۔ جسے ہم نے گدھے پر چڑھایا۔"

"ہم سفید پوش کا کوئی لحاظ نہیں کرنے دیں گے۔ انصاف کے سامنے سب برابر ہوتے ہیں۔"

کامریڈ بولا۔۔ بنتا بہت عرصہ پہلے کامریڈوں کی پارٹی کا ممبر ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کسانوں کے مورچے میں قید بھی کاٹ آیا تھا۔ پھر پاکستان کے قیام پر مسلمانوں کا مال لوٹ کر کامریڈوں میں سے نکل گیا تھا اور اب سرحد پر سمگلنگ کیا کرتا تھا لیکن گاؤں میں سب اُسے "کامریڈ" کہہ کر ہی بلایا کرتے تھے۔

"اچھا۔۔ یوں کرتے ہیں۔ ہرنامے مہرے سے پوچھتے ہیں۔ اگر وہ اسے معاف کردے تو ہمارے نزدیک یہ بری۔"

ہرنامے کو بلایا گیا۔ اس کے چہرے پر سے ابھی توے کی کالک پوری طرح اُتری نہیں تھی۔ لوگ ہنسنے لگے۔

ہرنامے نے تنک کر کہا "بھائیو۔۔ اگر اس کی عزت مجھ سے کم ہے تو پھر بے شک اسے معافی دیدو۔۔ لیکن اگر آپ میری اور اس کی عزت برابر سمجھتے ہیں تو اسے بھی وہی سزا دو۔"

کامریڈ کا بول بالا ہو گیا۔ لڑکوں نے بڑا ادھم مچایا۔۔ گدھے پر پالان پھر ڈال دی گئی۔

دونوں بزرگوں نے گاؤں کے داماد ہونے کا واسطہ دے کر اتنی چھوٹ حاصل کرلی کہ اس کے چہرے پر کالک نہیں پوتی جائے گی۔

کامریڈ اور اس کے ساتھیوں نے رام سندر کو اٹھا کر گدھے پر سوار کر دیا۔

"اس کے چہرے پر کالک ملنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ وہ تو پہلے ہی کالا ہو رہا ہے۔"

"کیوں بھیا لالہ — کس بھاؤ بک رہی ہے؟"

"اب کوئی اخبار کی خبر سناؤ — کیسے چپڑ چپڑ اپنی سرکار کے گُن گاتا رہتا ہے۔"

دوپہر کا یہ ہنگامہ ختم ہوا ہی تھا کہ گاؤں سے دو بھینسوں کے مرنے کی خبر آئی — تخت پوش پر بیٹھ کر غور و خوض ہونے لگا۔

"یہ اصول کی خلاف ورزی کرنے والے اُپائے پورا ہی نہیں ہونے دیتے۔ بیماری رُکے تو کیسے رُکے۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سادھو کا خیال چھوڑو — ٹیکے لگوا دو۔"

"وہ تو کوئی پاکھنڈی سادھو تھا۔ سادھوؤں کو بدنام کر رہا ہے۔ کراماتی سادھو کا کوئی ثانی نہیں۔"

"رات کو وہ سادھو کبھی کبھی سوجایا کرتا تھا۔ ہمارے گرنتھی نے ہمیں بتایا تھا۔"

"گرنتھی تو یوں ہی جھوٹ بولتا ہے۔" جو لوگ سادھو کو اپنے ہمراہ لائے تھے اُن میں سے ایک نے کہا۔

"خیرات میں ملی گندم وہ گھی اور میدے کے عوض میں کیوں دے گیا؟ گاؤں کی دی ہوئی خیرات اگر ذرا سی بھی گاؤں میں رہ جائے تو ثواب کیسے ہوگا؟"

"چیتو کنجر ہی کو اتنی سمجھ ہونی چاہیے تھی۔ اس نے وہ گندم کیوں لی؟ پیسے کہیں بھاگے تھوڑے جا رہے تھے۔ کل یا پرسوں دیرے سے لے آتا۔ ڈیرا کون سا دلایت میں ہے۔"

"ان دوکان داروں کی بھلی پوچھتے ہو۔ ان کو تو اپنے پیسے سے غرض ہے۔ ان کو کیا کوئی مرتا ہے تو مر جائے یہ اپنے دام کھرے کر لیتے ہیں۔"

"میں نے تو ایک اور بات بھی سُنی ہے۔ مندر کے چوراہے میں رات کو ہڈیوں کے ڈھانچوں میں سے بھینسے کا سر لاکر اُس پر کوئی عورت نہا گئی ہے۔"

"کسی سادھو نے بیٹا حاصل کرنے کی یہ ترکیب بتائی ہوگی۔"

کسی کی اونچی اونچی ڈھائیں سنائی دیں۔ اس کے نزدیک آنے پر پتہ چلا کہ تیجو مذہبی پاگلوں کی طرح — "میری بلو — میری بلو" چیخ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کی پوری بات کا پتہ چلا: باہر سے گھاس چر کر لوٹی — کان ڈھیلے، آنکھوں میں گید — روہانسی صورت — میرے ہاتھ سے نوالہ بھی

نہ لیا۔ حلق خشک ہوگیا۔ سجن سنگھ نے سلاخ گرم کر کے گلٹی کو گلانے کا جتن کیا۔ اُسے دیسی گھی بھی دیا۔ لیکن وہ پھڑ پھڑا کر جا پڑی۔ اچھی نسل کی بھینس تھی۔ میں نے تو اپنی بلّو کا ایک بال بھی ۔۔۔"

سب نے تیجو سے بڑی ہمدردی جتائی۔ اور تقدیر کے آگے سر جھکا دینے کو کہا۔

"میرے خیال میں تو کراماتی سادھو کے بغیر اس گاؤں کی بپتا دور نہیں ہوگی۔ اس کی کرامات کا تو کوئی اور چھور نہیں۔ جس نے اپنی اندری کاٹ دی ۔۔۔۔" سرپنچ نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"میری مانو تو کچھ لوگ اس کی طرف دوڑا دو۔ اگر ہم نے یہ بات صبح پر چھوڑ دی تو پھر کل کی طرح ہم سے پہلے ہی کوئی اُسے نہ لے جائے۔"

سارا گاؤں چمتکاری سادھو کا انتظار کر رہا تھا۔ کب وہ ان کے گاؤں میں قدم رکھے اور ڈھور ڈنگروں پر جادو ٹونا کرے ـــــ لیکن اب تیجو مذہبی کو کسی کا انتظار نہیں تھا ـــــ اُس کی قسمت کی ڈور کٹ چکی تھی۔

مہندر سنگھ جوشی

موتی

"لے تجھے ایک موتی دوں"۔ خفیف اور نادم دِتّے نے قریب آ کر چپکے سے دس دن کا ایک دودھ جیسا سفید پِلّا اپنی بیوی کے قدموں کی طرف سرکا دیا۔

رکھی تختے پر بیٹھی سات بل کھا گئی "موتی؟" اُس کی چیخ حقارت سے لبالب تھی۔

پھر جب اُس نے بچے کی آنکھیں دیکھیں تو وہ مے کی پیالیاں تھیں، مصری کے کوزے تھیں، اور اُسی دم اُس نے اس کو اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔

ملک کی تقسیم کے وقت بڑی منحوس خبریں پھیلنی شروع ہوئیں اور لوگ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ اور دِتّے کے ایک جگری دوست نے بڑے اطمینان سے اُسے سمجھایا "تو بھی پاکستان چلا جا"۔ لیکن دِتّے نے سینہ تان کر یوں تیوری چڑھالی جیسے اُسے ببول کے کانٹے کی طرح کھٹکتی ہوئی گالی دیدی گئی ہو۔ اُس کا باپ یہیں۔ دادا یہیں۔ باپ دادا کے باپ دادا یہیں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی مٹی گندم بنی، مرچ اور گنّا بنی اور اب نہ جانے وہ کتنی ددھاوا سنگھ کے لہو میں ہے کتنی جگنے کے جسم و دل میں ہے۔

اس کا بڑا بیٹا سرو کے تنے کی طرح چھ فٹ لمبا تھا۔ ایک پولیس افسر سے اُلجھ پڑا تھا۔ اس سے باپو گاندھی کے خلاف بُرا بول سُنا نہیں گیا تھا۔ نازک جگہ پر چوٹ لگنے سے نہ جانے وہ کہاں تتر بتر ہو گیا۔ اگر اُس کے پھولوں میں سے کوئی پھُول مل جاتا تو وہ اس کا تعویذ منڈھا لیتا اور جدھر جاتا اُسے ساتھ لے جاتا مگر پھولوں کی خوشبو بھی اُس تک نہ پہنچی۔ اس کا دوسرا بیٹا شریف اور ملنگ اس کے بڑھاپے کا سہارا نئی لنگی اور تہمد پہن کر اپنے ننہال گیا اور لوٹ کر نہ آیا۔ بچّہ قسم کھاتا تھا کہ اُس کی لاش اُس نے سرہند نہر میں تیرتی ہوئی دیکھی تھی۔ شاید کسی جتھّے نے اس کا کام تمام کر دیا ہو۔ کوئی مومن بھی تو اسے ذبح کر سکتا تھا۔ اس وقت کوئی دھرم اور مذہب کہاں رہ گیا تھا۔ خدا کہاں رہ گیا تھا۔ یہاں

کاہلا سنگھ نے بھی چبوترے پر سوئے بڑے سگے بھتیجے کا گلا کاٹ دیا تھا جائیداد کی خاطر۔ اور سوچا تھا کہ اس کے قتل کا الزام کسی مسلمان پر لگا دیا جائے گا۔

آدمی بوریا بستر تو باندھے۔ ٹرنک اور کنستر اُٹھالے۔ لیکن جگہ جگہ خوابیدہ سگے سمبندھیوں کی روحیں کہاں اُٹھالے جائے۔

"اونہہ — تم پاکستان چلے جاؤ" دِتّے کو روہانسی سی ہنسی آئی "کس کے پاس چلے جائیں پاکستان — وہاں ہمارا کیا ہے؟"

اور پھر آگ جب چاروں طرف بھڑک اُٹھی تو گاؤں کے بزرگوں نے اللہ دتا سے کہا۔ "کچھ اور نہیں تو اپنا نام ہی بدل لو۔ نہ جانے کہاں کہاں سے آئے ہوئے سنڈے تم پر ہاتھ اُٹھا دیں۔ پہلے تو تمہارے بھی آباؤ اجداد نتھو اور بھولو ہوں گے۔ وہ مکّے سے تو نہیں آئے تھے یہاں — کیا فرق پڑتا ہے"

"تجھے اس جانور کے گوشت یا اُس جانور کے گوشت سے مطلب۔ روٹیاں تو نمک ہی سے کھانی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پیاز کے ساتھ — ذرا سی کراہت کی بات ہے"

دِتّے نے دل ہی دل میں مشورہ کیا اور اکثریت کی بات مان لی۔

اور بعد میں اُس نے محسوس کیا کہ سچ مچ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ پہلے لوگ اللہ دتا کو دِتّا کہا کرتے تھے پھر اُسے ہردت سنگھ کہنے لگے۔ اگرچہ اُس کے آگے پیچھے صرف وہی رکھی کی رکھی تھی مگر گاؤں کے چند شریر لڑکے دتے کے حلق سے ان چکھے حرام کو اُتارنے کے بعد بھی ناراض رہے کہنے لگے کہ ہم مذہب کی اس تبدیلی کو نہیں مانتے۔ یا تو کمہار یہاں سے سیدھی طرح چلے جائیں ورنہ ہم جانیں اور ہمارے ہتھیار۔

کسی دانا شخص نے دتّے تک یہ بات پہنچا دی کہ وہ اپنے کپڑے لتّے بے شک رکھ لے مگر اپنے چار گدھے لڑکوں کے حوالہ کر دے۔ وہ اصرار کر رہے ہیں کہ اپنے بہن بھائی کے یہاں رہ جانے کی خوشی میں جشن منائیں گے۔ دِتّے نے یہ بات سنی تو اس پر نشہ سا طاری ہو گیا "بھئی واہ — اگر ہمیں اپنے ساتھ ملانے اور بھائی بنانے کا اتنا چاؤ ہے تو گدھے کیا میں اپنے ہاتھ اور پاؤں چاروں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں" وہ بولا۔

بوجھ ڈھونے کی جو دو روپے کی کمائی تھی وہ تو جاتی رہی لیکن دِتا بے روزگار نہ رہا۔ سفید پوش نتارا سنگھ نے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال اُس کے سپرد کر دی۔ روٹی کپڑے پر — اسے پندرہ روپے

نقد دینے بھی منظور کر لیے مگر فصل کے بعد۔

پچپن برس سے اوپر کی رکھّی کسی کی روٹی کاتتی، کسی کا گیہوں پیستی۔ دھان کی چھان ٹھیک کرتی اور دیواریں پوتا کرتی۔ اتنا کچھ کرنے پر بھی گھڑے میں کبھی پاؤ آٹا ہوتا اور کبھی نہ بھی ہوتا۔ اس بات پر وہ زیادہ جز بز نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل کو سینکڑوں پیچوں اور اُلجھاوؤں میں ڈالتی لیکن اپنے جگر کے ٹکڑوں کو نہ بھول سکتی اور وہ رات بھر روتی رہتی۔ دوپٹے میں مُنہ چھپا کر۔ اور جب کہیں سے بھی کوئی کام نہ ملتا تو دن کو بھی رویا کرتی۔

ایک شام کو جنگیر بھنگوا اُسے بلانے کے لیے آیا۔ اس کی بہو اُمید سے تھی۔ نعمت دائی کے جانے کے بعد دایہ ملتی ہی نہیں تھی۔ نہ نزدیک نہ دُور۔ اور رکھّی اس دھندے سے بالکل واقف نہیں تھی۔ اس نے خود ہی دتے کے چار بچوں کو جنم دیا تھا۔ خیر اس نے دنوں کو ہلکان ہو کر راتیں جاگ کر وضع حمل پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

وہ کھاتے پیتے جاٹ تھے۔ ساٹھ گھماؤں زمین کے مالک تھے۔ پہلے بیٹے کا مُنہ دیکھ کر گلاب کی طرح کِھل اُٹھے۔ بہو نے کہا "رکھّی — بعد میں نہ کہنا کہ تو جھجک گئی۔ جو جی میں آتا ہے مانگ لے" اور رکھّی نے بلا سوچے سمجھے ایک پتھر سا مار دیا "جگ جگ جیو۔ مجھے تو ایک گدھا لے دو"

رکھّی کی اس بات پر جنگیر کے خاندان کے لوگوں کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ لیکن انھوں نے اگلی صبح گدھے کا ایک تین مہینے کا بچہ اس کے دالان میں لا کھڑا کیا۔

دِتّا اپنی بیوی کی موٹی عقل پر بہت سٹپٹایا "اے نصیب جلی تو کچھ مانگنے ہی لگی تھی تو کوئی اور چیز مانگتی۔ یہ بہنوئی تو نہ جانے کب تک ہمارے پلّے سے کھائے گا۔ اور پھر ایک گدھے سے بنتا ہی کیا ہے نہ اینٹیں ڈھو سکتا ہے — نہ سامان"

رکھّی نے دِتے کی دہائی شور و غل میں گم کر دی۔

بچہ روئی کے گالے کی طرح سفید تھا — وہ کبھی اس کو دودھ سے مل کر نہلاتی۔ کبھی اس کے بدن پر مہندی سے مورتیاں بناتی۔ کبھی اس کے بالوں کو گھنگریالہ بناتی۔ گدڑی تیار کرتی۔ دِتا ایک لمبی آس کی سُتلی بٹنے لگا۔ لیکن رکھّی نے اس کا اٹیرن ہی دُور دے مارا اور بولی "تو جو کچھ بنا رہا ہے بنا لے۔ لیکن تجھے اپنے ہی کندھوں پر لادنی پڑے گی۔ میں موتی کو بوجھ نہیں اُٹھانے دوں گی۔ کبھی ایک تولہ بھی"

رکھّی نے گدھے کا نام موتی رکھ دیا تھا۔ لوگ جانتے تھے۔ کیوں — وہ خوب صورت بہت تھا۔

لیکن اُس کی اپنی ان سوچی باتیں کچھ اور ہی تھیں۔ امام دین اُس کا بڑا بیٹا تھا۔ توفیق چھوٹا تھا۔ موتی میں دونوں کے ناموں کے حروف تھے۔ ایک کے نام کا "م" اور دوسرے کے نام کا "ت"۔ وہ جب بھی ہونٹوں سے موتی کا لفظ ادا کرتی وہ لفظ شہد سے بھرپور ہوتا۔

اور پھر دِتّے کو میعادی بخار نے آدبوچا۔ بیس دن لگاتار چڑھتا رہا۔ چار دن کے لیے جان چھوڑے لیکن پھر آگھیرے۔ رکھی اسے پانی پلائے۔ اس کے ہاتھ پاؤں دبائے کہ گھر گھر کام کی تلاش کرے۔ دوا کی پڑیا، جوشاندہ، گڑ کی ڈلی چائے اور بکری کا تھوڑا سا دودھ اُسے لانا پڑتا۔ جس سے پانچ روپے پکڑتی وہ دسویں دن آٹھ روپے کا سوال کرنے لگتا۔ دس لالچی منہ بند کرنے کے لیے اس نے گِدّھا مل کے یہاں جا کر پناہ لی۔ اُس نے گھر آئی رکھی کی بات رکھ لی۔ لیکن ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اُس کا بیٹا لچھمن پہلے ہی موتی کو رسی سے پکڑ کر لے گیا۔

رکھی نے اندر گھس کر گِدّھے کو ہزار بددعائیں دیں۔ اس کے اگلے پچھلے سب گھر والوں کو کوسا۔ دِتّا سمجھانے لگا۔ "گِدّھے کے گھر کے لوگوں سے ہماری پیڑھیوں سے بنتی چلی آرہی ہے۔ اگر وہ خود گاؤں میں ہوتا تو پھر دیکھتی۔ اس کا بیٹا لچھمن صرف دکھائی سنگدل دیتا ہے مگر دل کا بُرا نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ اُس نے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اگر وہ سارا سودھی لگا لیتا اور گھر میں جھاڑو پھیر جاتا تو ہم کیا کر لیتے؟"

رکھی اس کے پیچھے بھی پنجے جھاڑ کر پڑ گئی اور اُس نے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچ لیا۔

دِتّے سے پہلے موتی کے مالک اُسے دن بھر کوڑے کرکٹ پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور وہ کوڑا کھایا کرتا تھا۔ لیکن رکھی اُسے اپنی دہلیز سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ اپنے دُھلے اور پاکیزہ ہاتھوں سے اُسے کھلایا کرتی تھی اور اس کے چارے میں چنے ہوتے تھے۔ جب وہ لید پھینکتا تو وہ فوراً اُسے اُٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیا کرتی تھی۔ موتی کا تھان ہر وقت چمکتا رہتا تھا جیسے کسی نے آنکھوں کی پلکوں سے وہاں جھاڑو دی ہو۔ وہ اُدھر سے آتی تو اُسے آغوش میں لے لیتی۔ اِدھر سے جاتی تو اُسے پچکار جاتی۔ موتی کو بنیوں کی حویلی کوڑے کرکٹ سے بھی بُری معلوم ہوئی۔ اُس نے چارے پر منہ نہ مارا — وہ سر جھکائے کھڑا رہتا اور اپنی قسمت پر روتا رہتا۔

جمعہ کی رات رکھی کو ایک خواب آیا جیسے کسی نے اس کے دونوں بیٹوں کو اُلٹا لٹکا دیا ہو، اور اُن کے سروں میں سے مومیائی قطرہ قطرہ نیچے جلتی ہوئی تیل کی کڑھائی میں ٹپک رہی ہو۔ وہ چونک کر اٹھی اور اُس نے دِتّے کو بھی جگا دیا۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ وہ بنیوں کا منہ نہیں دیکھے گی۔ لیکن ان حالات میں وہ اپنی قسم کو کیسے برقرار رکھتی۔ اُس نے بڑی مشکل سے تاریک لمحات

گزارے اور پھر منہ اندھیرے ہی وہ گِدّھے کی حویلی کی طرف دوڑی۔

بھوک تو ہاتھیوں کا غرور بھی توڑ دیتی ہے۔ اور نو عمر رشی جوگی بھی اُسے برداشت نہیں کر سکتے کتنے ہی دن موتی کی ٹانگیں پانچ پہاڑوں کے بوجھ تلے ڈگمگاتی رہیں۔ اس کے بدن میں ہاتھ بھر لمبی کیلیں گڑتی رہیں۔ پیٹ میں تیزاب کے مٹکے اُبلتے رہے۔ چھلانگیں لگا کر بڑھتا ہوا درد۔ اور پھر یہ درد بالکل جاتا رہا۔ جب رکھی وہاں پہنچی تو وہ گندے پیشاب میں منہ کے بل گرا پڑا تھا۔ اس کے لبوں پر اُس کی جان جیسے اُس کے انگ انگ کو الوداع کہتی ہوئی نکلی جا رہی تھی۔

رکھّی کے بدن میں کپکپی چھڑ گئی۔ وہ اُلٹے پاؤں دوڑی اور اپنے گھر میں آ کر مونڈھے پر آ گری۔

"لے تجھے موتی دوں"۔ دِتّے نے چپکے سے قریب آ کر ایک دس دن کا دودھ جیسا سفید پلّا اس کے قدموں کی طرف سرکا دیا۔

"موتی۔؟" حقارت کی بوچھاڑ کرتے ہوئے رکھّی چیخ اٹھی۔ ایک بہت پاکیزہ لفظ ایک آوارہ پلّے سے جوڑ کر دتّے نے جیسے اس کے وجود کے بارود کو دیا سلائی دکھا دی تھی۔

"تو اس کی آنکھیں تو دیکھ ..." اس نے بڑی ملائمت سے پلّے کی پیٹھ کا پشمینہ سہلاتے ہوئے کہا۔

رکھّی نے ہونٹ چاٹتے اور دُم ہلاتے پلّے کے مُنہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا جیسے وہ توفیق کی آنکھیں ڈھونڈ رہی ہو۔ مدھ بھری آنکھیں۔ امام دین کی آنکھیں ڈھونڈ رہی ہو۔ مصری کے کوزوں جیسی آنکھیں پھر اُس نے اپنے پیٹ میں اُس کا مُنہ دبا کر ایک چیخ بلند کی "میرے بچے"

پلّے کو اُس کی کچھ سمجھ نہ آئی اور وہ رکھی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے بالکل بیگانہ قطعی پرایا دیکھتا ہے۔

رکھّی نے کئی اور چیخیں بلند کیں۔ پہلی چیخ سے بھی زیادہ بلند۔ کتا ڈر کے مارے بلبلا اٹھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں یوں پھڑپھڑا رہے تھے جیسے اس کے نیچے انگارے بچھے ہوے ہوں۔

رکھّی نے ایک سنبھالا لے کر دائیں بائیں بکھرا ہوا سارا غم اپنے سینے میں سمیٹ لیا اور پھر جب وہ اُس پلّے کا مُنہ چومنے لگی تو اس کی آنکھیں متبسّم ماتا سے ناچ رہی تھیں۔

لوچن بخشی

بازار کا ماتم

.... اور وہ مر گیا۔

ابھی مشکل سے آدھی رات بھی کہاں ہوئی تھی۔ ابھی تو فیشن ایبل بازار کے شوکیسوں کی بتیاں جھلمل جھلمل جل رہی تھیں۔ ابھی دور دور یہ روشنیاں پوری آب و تاب سے جگمگا رہی تھیں۔ اور اس جلتے بجھتے بازار میں اُسے مرنے کی سوجھی۔

اے بھلے مانس — ابھی تو سینما کا دوسرا شو بھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی سڑک پر رکشا والوں کی لمبی قطار بھی نہیں لگی۔ ابھی پان کی پیک نہیں اُچھلی۔ ابھی موتیے کے ہار نہیں لہرائے۔ اور تو اور ابھی رُلیا جواری شراب پی کر لڑکھڑاتا ہوا نہیں آیا اور تجھے یہ کیا سوجھی کہ یہ سب نظارے چھوڑ کر تو نے بھری پُری دنیا سے کنارہ کشی کر لی۔ تو بازار کی پٹڑی پر یوں لیٹ گیا جیسے ماں نے بستر لگا دیا ہو۔ تو نے کس آسانی سے موت کو گلے لگا لیا۔ اتنی آسانی سے تو رُلیا جواری نے بھی تجھے پیسہ نہیں دیا ہوگا۔

اُس کی لاش نے جیسے ایک جھرجھری سی لی اور نیون روشنی میں اس کے چہرے کی رگیں جیسے تن سی گئیں۔

نہیں ابھی تم میری طرف یوں نہیں دیکھ سکتے۔ ابھی تم مجھ سے ہمدردی نہیں جتا سکتے۔ ابھی مجھ میں جان ہے۔ ابھی تو میری آنکھوں میں تمہاری تصویر ہے۔ میں تمہاری آواز سُن سکتا ہوں۔ رُلیا جواری کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو پہچان سکتا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ رُلیا جیت کر آیا ہے کہ ہار کر۔ رُلیا جیت گیا تو میرے پو بارہ — ہار گیا تو میرے تین کانے — رُلیا بس یوں ہی ہے۔ بڑے کھلاڑی تو یہ ہیں۔ اس بازار کے بیوپاری۔ جنہوں نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا کہ جی رہا ہوں کہ مر چکا ہوں۔

.... اور آج وہ مر گیا تھا۔

اس کا ننگ دھڑنگ جسم فیشن ایبل بازار کی پٹڑی پر پڑا تھا۔ اُس کے تن پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اور

فیشن ایبل بازار کی تمام دوکانیں ریڈی میڈ لباسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کا بدن سردی سے کانپتا رہا تھا۔ ہلکا ہلکا کہرا چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ دُور کہیں سادھو دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ دھونی میں گیلی لکڑیاں سُلگ رہی تھیں۔ دھوئیں کی بو سارے کہرے میں رچی ہوئی تھی۔ اور وہ عمر بھر گیلی لکڑیوں کی طرح سُلگتا رہا تھا اور اس کی دھوئیں بھری آنکھوں میں آنسو تھے۔ فضا میں کسی سادھو کی آواز گونج رہی تھی "پانی میں مچھلی پیاسی — مجھے سُن سُن آوے ہاسی" ہاں اے رمتے اور چلتے جوگی — ادھر دیکھ — میں پانی میں مچھلی کی طرح پیاسا ہوں۔ مَیں کپڑوں سے بھرے بازار میں برہنہ مر رہا ہوں۔ میرے ننگے بدن میں روح بھی ننگی ہے — اور ننگی روح چولا بدلنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔

نیون روشنیاں جلتی رہیں۔ بجھتی رہیں۔ بجلی کے جھلملاتے اُجالے میں اُس کی رُوح گھپ اندھیرے میں بھٹکتی رہی۔ گھپ اندھیرا ایک گلی میں تھا۔ جس کے چاروں طرف دیواریں اٹھی ہوئی تھیں۔ اونچی اونچی دیواریں۔ اور اُس کی روح آزاد ہونے کے لیے اُن سے ٹکرا رہی تھی۔ دیواروں سے اپنا سر پٹک رہی تھی۔

ٹن ٹن — دور کہیں گھڑیال بج اُٹھا — اس کے اندر سے آواز اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی — وقت ہو رہا ہے — ہر کوئی وقت کو پہچانتا ہے — ہر کوئی اپنے وقت کی تلاش میں رہتا ہے۔ ادھر گھڑیال کی ٹن ٹن گونجی اور ادھر سے آواز آئی۔

"وقت ہے — ٹوٹ پڑو"

ٹن ٹن ایک فقیر کی صدا ہے۔

غافل تجھے دیتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

رُوح بلبلاتی ہے — وہ بھی گھڑیال کی آواز کو پہچانتی ہے۔ اور گھڑیال پر بار بار چوٹ پڑتی ہے، وہ تو بے گناہ ہے — ہم گنہگاروں کا کیا حال ہوگا — چھوڑو — یہ سب سادھوؤں کی باتیں ہیں — تم دھونی رماؤ اور دھونی میں گیلی لکڑیوں کی طرح سُلگتے رہو — یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ جاتی بہار کی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کپکپا کر رہ گئی۔ اُس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہیں۔ ایک شیشے جیسی چمک ان میں لرز کر رہ گئی تھی۔ ایک آنسو اُس کی آنکھوں میں اس طرح اٹکا تھا کہ لرزنے کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ رنگ برنگی دودھیا روشنیاں اس کی آنکھوں میں جل اور بجھ رہی تھیں "ابھی ابھی سرخ — اور ابھی ابھی سبز اور پھر سفید کی سفید"

"کھٹ۔ کھٹ۔" سی ہوئی — شاید کوئی دوکان کا تالا توڑ رہا ہے — یہ چور رات کو کیوں آتے ہیں۔ ڈرتے ہیں۔ دھت ترے کی.... موت کبھی کسی سے نہیں ڈرتی۔ تمام کوٹھڑیاں اور دروازے توڑ کر آدھمکتی ہے — وقت بے وقت دبے پاؤں رکھتی ہوئی۔ لیکن یہ تو کوئی نرم نرم قدم نہیں رکھ رہا۔ یہ تو کوئی بھاری بوٹ ہیں جن میں کیلیں جڑی ہیں۔ یہ کھٹ کھٹ فوجا سنگھ کی لوہے سے منڈھی لاٹھی کی ہے۔ فیشن ایبل بازار کا چوکیدار — حوالدار فوجا سنگھ —" دوسری بڑی لڑائی میں ہم نے جرمنی کی میجنولائن پھلانگتے ہوئے اتنی پھرتی نہیں دکھائی تھی۔ موت سالی کا کیا ڈر۔ ایک دن تو آکر رہے گی۔ لیکن کیا کہیں۔ اس سالی چوکیداری میں بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ کیا خبر کب آجائے۔ دن کو گاہک آتے ہیں۔ رات کو چور۔" مگر حوالدار فوجا سنگھ صرف چور اور گاہک ہی کو پہچان سکتا ہے۔ موت کی پہچان اُس کی آنکھوں میں بھی نہیں تھی۔ اب وہ اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔

"کہاں چوراہے میں پڑا ہے۔ کیا آئی نہیں تیری وہ....." پٹڑی پر پڑی لاش کی آنکھیں بے صبری سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ فوجا سنگھ کو پکار رہے تھے لیکن آواز تھی کہ اس کے حلق میں جم کر رہ گئی تھی۔ فوجا سنگھ تیز تیز قدم اُٹھاتا گزر گیا۔ اُس کی آنکھیں کسی جرمن سپاہی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یہ بازار نہیں۔ میدانِ جنگ ہے بھیّا — یہاں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت کیا ہو جائے ہاں فوجا سنگھ۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔ جرمن سپاہیوں کا تو پھر کوئی ٹھور ٹھکانا ہوگا لیکن اس سالی کا کچھ پتہ نہیں۔

فیشن ایبل بازار کی پٹڑی پر پڑا ہوا اُس کا جسم اکڑنے لگا۔ رنگ برنگی نیون روشنیاں دمبدم رنگ تبدیل کرتی رہیں۔ کرتی رہیں — دنیا — گرگٹ کی بچی — اور پھر دنیا جیسے لنگڑی ہوگئی۔ لنگڑا کر چلتی ہوئی وہ اس کی طرف بڑھنے لگی — اس کا بدن تمباکو کے دھوئیں میں ملفوف ہوگیا تھا — "ہا۔ ہا۔ ہا۔" وہ ہمیشہ کی طرح اپنی کمینی ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ اسے پہچانتا تھا — لنجی ٹھاکری — اس بازار میں اُسے سب جانتے تھے۔ کوئی اُسے بھکارن کہتا تھا۔ کوئی پگلی۔ وہ دن بھر سگریٹ کے ٹکڑے چنتی رہتی اور رات کو اس کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پیتی رہتی۔ پیتی رہتی۔ ٹھاکری کو دیکھ کر اُس کی نظریں اوپر اُٹھ گئیں۔ اُدھر مرلی منوہر بھگوان کرشن کی مورتی کے پاس شہتیر ایک طرف سے اُبھرا ہوا تھا۔ وہیں وہ ہر روز اپنی روٹیوں والی پوٹلی لٹکایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ٹھاکری کے آنے سے پہلے وہاں پوٹلی لٹکا کر یہیں اسی جگہ اس کا انتظار کیا کرتا تھا اور پھر دونوں مل کر روٹی کھایا کرتے تھے۔ لیکن آج اُسے بھوک ہی نہیں لگی تھی۔ اس کا پیٹ جیسے پتھر ہوگیا تھا۔

کیا سو گیا ۔" ٹھاکری بولی ۔

کوئی جواب نہ ملا ۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی ۔ ایک کمینی سی ہنسی فضا میں تیرتی رہی ۔۔۔ اس کا بدن بدستور اکڑا رہا ۔ اس کی شیشے جیسی پتھرائی آنکھیں حیرت و استعجاب سے دیکھتی رہیں ۔ ٹھاکری نے اس کے بدن کو چھو کر دیکھا ۔ اچانک ٹھاکری کے سگریٹ کا دھواں زیادہ گھنا ہو گیا ۔ اُس کی وحشت بھری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور پھر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ ایک گہری سیاہ پرچھائیں ان پتلیوں میں سے نکل کر نیون روشنی میں ننگی ہو گئی ۔ اس نے دوبارہ اس کے جسم کو چھو کر دیکھا ۔ لیکن وہ ویسے کا ویسا پڑا رہا ۔۔۔ ننگ دھڑنگ ۔۔۔ اس کے تن پر ایک برائے نام لنگوٹ تھا ۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا ۔ لنگوٹ ۔۔۔ اس نے اپنی ساری زندگی کی کمائی آج تک اپنے لنگوٹ میں چھپا کر رکھی تھی ۔ ایک تھیلی میں ۔ ایک جھٹکے سے اُس نے اس کا لنگوٹ کھول دیا مگر اس کو وہ تھیلی دکھائی نہ دی ۔ ایک گندی بات اس کے ہونٹوں پر آئی اور بڑی نفرت سے اس کے بیحس و حرکت جسم کو دیکھ کر اُس نے "اخ تھو" کیا اور پھر "ہا ہا" کرتی ہنسنے لگی ۔ اور پھر ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں ایک ٹیس سی اُٹھی ۔ للچائی نظروں سے اُس نے اوپر لٹکتی ہوئی پوٹلی کی طرف دیکھا ۔ پوٹلی تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ اُس نے اس کی لاش کو تھوڑا سا دیوار کی طرف گھسیٹا ۔ پھر اُس نے اس کی چھاتی پر پاؤں رکھا اور اُچک کر پوٹلی اُتار لی ۔ اور مڑ کے دیکھے بغیر "ہا ہا" کرتی ہوئی آگے کی طرف بڑھ گئی ۔

اور پھر ایک ایک کر کے سب نیون روشنیاں بجھ گئیں ۔ صبح سویرے سیر کرنے والوں کی آوازیں شروع ہو گئیں ۔ دو بوڑھے اس کے قریب سے گزرے تو اُسے گہری نیند سویا دیکھ کر بولے ۔

"کیا گھوڑے بیچ کر سویا پڑا ہے ۔"

"یہ لوگ کیا بے فکری کی نیند سوتے ہیں ۔ ہمیں تو رات بھر نیند نہیں آتی ۔"

جوں جوں دن کا اُجالا بڑھتا گیا لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھتی گئی ۔ پھر کوئی بولا "ہیں ۔ یہ تو کوئی مرا پڑا ہے ۔"

"ہمارے بازار کا پاگل ہے ۔"

یہ آواز سیٹھ دھنی رام کی تھی ۔ مرلی منوہر کی مورتی والی دوکان جس کے برآمدے میں اُس کی لاش پڑی تھی اس سے دو تین دوکانیں چھوڑ کر سیٹھ دھنی رام کی دوکان تھی ۔ وہ اُسے اچھی طرح جانتا تھا ۔ کمینہ آج ہمدردی جتا رہا تھا ۔ یہ دُنیا کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے ۔ ابھی تو اُسے وہ بات یاد تھی ۔۔۔ گرمیوں کی کڑکتی دوپہر ۔۔۔ پیاس کی وجہ سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے ۔ وہ دو گھونٹ پانی کے

لیے ترستا رہا۔ سیٹھ دھنی رام کی دوکان کے آگے جا کھڑا ہوا۔ دھنی رام اس وقت اپنی دوکان کے اندر رکھی ہوئی مشین کا ٹھنڈا پانی گلاس میں ڈال کر پی رہا تھا۔ اُس نے اُس سے کہا۔

"سیٹھ۔ دو گھونٹ ٹھنڈا پانی"

"ٹھنڈا پانی۔ ابے جا۔ یہاں سے چلتا نظر آ۔ بڑا آیا کہیں کا۔ وہ سامنے مشین والا ٹھنڈا پانی بیچ رہا ہے۔ دو پیسے کا گلاس دیتا ہے" اور جب وہ اس مشین والے کے پاس گیا تو اُس نے کہا۔

"ابے۔ جاتا ہے کہ نہیں۔ میں نے سبیل نہیں لگا رکھی۔ دیکھتا نہیں کہ گرمی کتنی زیادہ پڑ رہی ہے اور یہ ٹھنڈا پانی مانگ رہا ہے۔ چل دُور ہٹ۔ میرا بکری کا وقت ہے"

ہاں گاہک اور موت کا کچھ پتہ نہیں۔ کمینے۔ یہ سب ایک ہی بولی بولتے ہیں۔ سب اپنے اپنے گاہکوں کو پہچانتے ہیں۔ ان کو اپنے گاہکوں سے کبھی فرصت نہیں ملے گی۔ ان کو موت کے لیے بھی کبھی فرصت نہیں ملے گی۔

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد لوگ اس کے اردگرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اور جس وقت "مدّی" اور "بھولا" ہاتھوں میں روٹی کے ڈبّے لیے مرلی منوہر کی مورتی والی دوکان پر پہنچے تو وہ دوکان ابھی تک بند تھی ـــــ یہ ایک انوکھی بات تھی۔ ان کے آنے سے پہلے دوکان اکثر کھُلی رہتی تھی۔

"بھولے" نے آہستہ سے کہا۔

"آج لالہ جی کے گھر میں خیریت معلوم نہیں ہوتی مدّی! یہ دوکان جو ابھی تک کھُلی نہیں ہے۔ کوئی مشکوک سی بات ہے"

"ہاں یار۔ بڑے شاہ جی کئی دن سے بیمار بھی تھے۔ کہیں ...."

دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ ایکا ایکی ان دونوں کی نظریں خود بخود سامنے کی دیوار پر چسپاں سینما کے ایک پوسٹر پر اُٹھ گئیں۔ اور پھر نظروں ہی نظروں میں یہ فیصلہ ہوا کہ اگر بازار آج بند رہا تو وہ ضرور سینما دیکھیں گے۔

"لیکن یار آج تو کوئی دوکان نہیں کھُلی" اور پھر ایک دم اُن کی نظریں اُس ہجوم پر لرز کر رہ گئیں جس میں ان کا مالک اور بازار کے بیوپاری تیزی سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ جیسے وہ سب پاگل ہو گئے تھے۔ وہ سب ایک بوان سجا رہے تھے۔ ناریل اور چھواروں کی جھالریں اُس بوان کے چاروں

طرف لٹک رہی تھیں۔ رنگ برنگے کاغذوں کی جھنڈیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ نفیس شال دوشالوں کا ڈھیر قطب مینار کی طرح بلند ہوتا جا رہا تھا اور اُس مینار کی تعمیر میں تمام بیوپاری بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ جوں ہی قطب مینار کی نئی منزل اُبھرتی بیوپاریوں کی گردن فخر سے اور بلند ہو جاتی

"کون مر گیا ہے؟" بھولے نے کسی سے پوچھا۔

"ہمارے بازار کا ایک آدمی — آج بازار بند رہے گا۔" اتنا کہہ کر وہ دوبارہ بھیڑ میں شامل ہو گیا اور بوان سجانے لگا۔

اتنے میں مدّی مرنے والے کی کھوج لگا چکا تھا۔ وہ دونوں بھیڑ میں سے باہر آ گئے۔

"سالے — کل تک وہ پاگل تھا لیکن آج آدمی بن گیا — کمینے!"

وہ دونوں ہاتھوں میں روٹی کے ڈبے لیے ہوئے کمپنی باغ کی طرف چلے گئے۔

"یار سُنا ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو بنی ہوئی روٹی نہیں کھانی چاہیئے۔" اُس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"چھوڑو بھی — روٹی میں بھلا کیا لگ گیا ہے۔" اور جب فیشن ایبل بازار کی سڑکوں پر بینڈ باجے کی دُھنوں میں بوان دھوم دھام سے نکلا تو مدّی اور بھولا بھی ہجوم میں شامل ہو گئے۔ بوان کے اوپر تیزی سے پیسوں کی بارش کی گئی۔ مٹھی بھر پیسے بھولے کی جھولی میں آ گرے۔ اس نے نعرہ لگایا۔

"ہمارے بازار کا پاگل!"

"زندہ باد!"

مدّی بولا — اور پیسے اکٹھے کر کے وہ دونوں مینی شو دیکھنے چلے گئے۔

گوردیال سنگھ

پھانس

بلنتو کے سُسر اور دیور ماگھی نے خوب شراب پی کر رات بھر گالیاں دی تھیں۔ اُس کی برابر کی بیٹی پاس پڑی تھی لیکن اُن باپ بیٹوں کو پھر بھی شرم نہیں آئی تھی۔ اس کے دونوں چھوٹے بیٹے سہمے ہوئے کبوتروں کی طرح چادر میں مُنہ سر لپیٹے پڑے رہے تھے اور گیالا عورتوں کی طرح پاس پڑا ہوا سنتا رہا تھا۔ لیکن اس کے ہوش و حواس بجا نہیں تھے۔ گیالے کو اُس نے جو قول دے رکھا تھا رات بھی اسے یاد آیا لیکن پہلے کی طرح "چلو — ہوا کیا —" اس سے نہیں کہا گیا تھا۔ پچھلے چند مہینوں سے وہ کبھی اس طرح نہیں کہہ سکی تھی۔

یہ پہلی بار نہیں تھی کہ اس کے سُسر اور اس کے دیورے گالیاں دی تھیں۔ بارہ تیرہ سال ہو چکے تھے۔ جب ان پر جنون سوار ہوتا اُسے گالیاں دیا کرتے۔ حتی الامکان اُس نے کبھی کسی کو بُرا نہیں کہا تھا لیکن وہ تو کچھ اتنے بدخُو آدمی تھے کہ گالیاں دئے بغیر جیسے اُن کی پی ہوئی شراب کے دام کھرے نہیں ہوتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ کبھی کسی مویشی کو بھی گالی نہیں دیا کرتی تھی کہ بات کہیں اُلٹی نہ ہو جائے۔ پہلے وہ برداشت کر لیا کرتی تھی لیکن اب پاس پڑی برابر کی بیٹی کے سامنے اپنے کسی قصور کے بغیر اس سے ان کی فحش کلامی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

بلنتو کو رات بھر نیند نہ آئی۔ اُس کے اندر جیسے کسی نے ببول کے کانٹوں کا گچھا بھر کر اُسے بکھیر دیا تھا۔ اُس سے کروٹ بھی بدلی نہیں جا رہی تھی۔ ببول کے کانٹوں کے درد سے اس کا انگ انگ چھدا جا رہا تھا۔ آدھی رات کو اُس کی آنکھیں ساون بھادوں کے تاروں کی طرح نم آلود ہو گئیں اور آدھی رات کے بعد آہستہ آہستہ خشک ہو کر جلنے لگیں۔ اور اس تپش کی آنچ سے خود بخود بند ہو گئیں اور جب وہ دوبارہ کھُلیں تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

دن کافی نکل آیا تھا۔ گیالا بیلوں کو چارہ دے رہا تھا اور اُس کی بڑی بیٹی انگیٹھی پر چائے رکھ رہی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بیخوابی کی کسک سے سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے ہر چیز اوپری اور پرائی لگی۔ آنکھیں زبردستی بند ہوئی جاتی تھیں۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں ملنے لگی۔ اچانک وہ دونوں ہاتھ سامنے لاکر ہتھیلیوں کو یوں دیکھنے لگی جیسے اُن میں تھوہر کے روئیں چبھ گئے ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہ ہاتھ جھاڑ کر آنکھیں ملنے لگی۔ پچھلے دو برس سے جب بھی وہ آنکھیں ملتی تھی تو اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ باجرے کے سٹے کی آخری پھانک کی طرح اپنے رنگ روپ کو مسل رہی ہے۔ ہر دفعہ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کے رنگ روپ کے تمام نقش مٹتے جا رہے تھے۔ بھُربھُرا اور کھوکھلا سوت کا گیند جسے چڑیوں نے نوچ نوچ کر بکھیر دیا تھا۔

جب بلنتو بیاہی آئی تھی تو اس کو دیکھنے کے لئے آئی ہوئی عورتیں اُس کی پوری تعریف نہیں کر پاتی تھیں۔ گاؤں کی سب سے بڑی نکتہ چین سودھاں نائن کو بھی اس میں کوئی کمی دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ اس کے حسن کی کوئی تشبیہہ نہیں دے سکتی تھی "پری جیسی" "مورت جیسی" "پھولوں کی ملکہ جیسی"۔ یہ سب الفاظ اُسے پھیکے پھیکے سے لگے تھے اور پھر اُس نے کہا تھا "قلاش جاٹوں کو گرا پڑا لعل مل گیا"۔ اُس کی آنکھیں اُسے واقعی لعل و گہر کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دی تھیں۔ اور آج جب چودہ برس کی مدت بمشکل گزری تھی اُس کی لعل و گہر جیسی آنکھیں ملگجی کوڑیوں کی طرح ہو گئی تھیں۔ ان لعل و گہر میں سے پھوٹتی ہوئی کرنیں اتنی مدھم پڑ چکی تھیں کہ ان کے آر پار کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نہ کسی باطنی شے کی تجلی۔ نہ کسی بیرونی شے کا عکس۔ جیسے ان کے دونوں طرف چودہ برس کی دھول جم گئی تھی اور وہ دونوں طرفیں دھندلی پڑ گئی تھیں۔

بیلوں کو چارہ دے کر گیالا چولھے کے قریب آ بیٹھا۔ "جتیاں" ان کی بڑی بیٹی نے ایک کٹورے میں چائے ڈال کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ جب اُس نے کٹورا اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا تو جتیاں نے نگاہیں اوپر اُٹھا کر اپنے باپ کی صورت کی طرف یوں دیکھا کہ گیالا اپنی بیٹی کی نظروں کی تاب نہ سکا۔ اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ لیکن جتیاں اُس کی طرف بدستور دیکھتی رہی۔ کبھی باپ کی گہری آنکھوں کی طرف اور کبھی اُس کی سخت اور تلِ چاولی داڑھی کی طرف۔ اور باپ بیٹی کی ان نگاہوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ بلنتو کے مُنہ سے ایک سسکی سی نکل گئی اور اُس نے اپنے دوپٹے کا ایک سرا مروڑ کر مُنہ میں لے لیا تاکہ سسکیاں دبی رہیں۔ وہ کانٹے بلنتو کے دل میں گڑ گئے اور اس کا رُواں رُواں ان سے چھد گیا۔ وہ بیٹھی بیٹھی پھر چارپائی پر گر گئی۔ اس کی پیٹھ اُن کی طرف تھی اس لیے گیالے

اور جتیاں کو کچھ پتہ نہ چلا۔

چائے پی کر گیالا نرمے کی گوڑائی کے لیے کھیت کی طرف چل پڑا۔ جتیاں نے گھر کا تمام گوبر اور کوڑا صاف کیا، چولھا چوکا سمیٹا اور کھیت پر روٹی بھی وہی لے کر گئی۔ بلنتو نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑی رہی۔ اُس نے روٹی بھی نہ کھائی۔ چھوٹے بچے نہ جانے کب خود ہی اسکول چلے گئے۔ سنسان گھر میں بلنتو کا دل اُکتا سا گیا۔ اور وہ کسی کام میں مشغول ہونے کے لئے اُٹھی۔ لیکن چارپائی پر سے اُٹھتے ہوئے اُسے سامنے کی سانجھی دیوار پر اپنے سُسر کی پگڑی دکھائی دی اور اس کے اندر بکھرے ہوئے کانٹوں نے ایک بار پھر اس کا انگ انگ چھلنی کر دیا۔ بلنتو پھر چارپائی پر گر پڑی اور وہ اُس وعدے کو بھول گئی جو اس نے گیالا سے کیا تھا۔

جب سے وہ بیاہی آئی تھی اس کی ساس اُسی وقت سے طعنے دینے لگی تھی۔ سب سے بڑا طعنہ اُس کے جہیز کا تھا۔ "کیا ہم خانہ بدوش تھے کہ مونڈی کاٹوں نے چاندی کے کڑے ہمارے سر منڈھ دئے ..... چاندی کو تھیلی میں ڈال کر کیا کوئی چاٹے گا۔" اگرچہ کافی دیر تک اُس نے بلنتو کے منہ پر یہ طعنہ نہیں دیا تھا لیکن پڑوسنوں سے کی ہوئی غیبت کا بلنتو کو پتہ چلتا رہتا تھا۔ بلنتو نے اپنی طرف سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ سارے گھر کا کام ان تھک کیا کرتی۔ دس آدمیوں کا کھانا بناتی۔ سات آٹھ مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی۔ کسی کے گلے میں کوئی میلا کپڑا نہ رہنے دیتی۔ گھر کو دہی کے برتن کی طرح چمکا کر رکھتی۔ لیکن دن پہ دن ساس کے طعنوں میں اضافہ ہوتا دیکھ کر اس کا دل افسردہ رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ جب کسی نہ کسی بہانے سے وہ بلنتو کے مُنہ پر بھی اُسے برا کہنے لگی تو بلنتو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ایک رات اُس نے گیالے کو ساری بات بتا دی۔ لیکن گیالا عورتوں جیسا مرد تھا۔ اُس نے بڑی نرمی سے کہا "میں جب سے پیدا ہوا ماں باپ کے سامنے کبھی بولا نہیں۔ اگر تم آگے سے بول پڑیں تو ساری رکھی رکھائی خاک میں مل جائے گی۔ تمہارے جو جی میں آئے کہہ لو لیکن میرے ماں باپ کے سامنے نہ بولنا۔ عمر بھر نہ بولنا۔"

اور گیالے نے اُس سے یہ قول لے لیا کہ وہ اس کے ماں باپ کے سامنے نہیں بولے گی۔ اور بلنتو کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے سرسبز کھیت میں پڑتے ہوئے پانی کے موکھے کے منہ میں کریر کے پیڑ کی گلی پھنسا دی ہو۔ اور اس کا باطن پیاسے کھیت کی طرح پہلے خشک اور پھر پھٹنے لگا۔

پورے تین برس تک وہ ساس کے کڑوے بول اور طعنے سنتی رہی۔ شرابی سُسر اور خود سر دیور کی سنی نہ جانے والی باتیں اور گالیاں سنتی رہی لیکن اس نے گیالے کو جو بچن دے رکھا تھا اسے ہرگز

ہرگز نہ توڑا۔ گیالے پر پہلے دن ہی سے اسے بہت ترس آتا رہا تھا اور وہ اُسے بچوں کی طرح چھپا چھپا کر رکھتی رہی تھی اور اس کا یہ ترس ایسی محبت بن گیا تھا کہ وہ گیالے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔

اور پھر اُس کے دیور کی شادی ہوئی۔ اُس کی دیورانی نے ان کا گھر بھر دیا۔ بلنتو کا رہا سہا لحاظ بھی ختم ہو گیا۔ اُس نے گیالے کو کئی بار الگ ہو جانے کا مشورہ دیا لیکن جب تک ماں باپ اور بھائی نے اس پر سو سو تہمتیں لگا کر اور اسے زن مرید کہہ کہہ کر اُسے گھر سے نہ نکالا تب تک وہ الگ نہ ہوا۔ الگ ہوتے ہوئے بھی گیالے نے عورتوں جیسی بات کی۔ باپ نے اس کے حصے کا پورا کھیت بھی نہ دیا اور جو کھیت دیا وہ باقی کھیتوں سے نکما تھا۔ خشک اور جھاڑ جھنکار سے بھرا ہوا۔ اور گھر کے سامان کا بھی پانچواں چھٹا حصّہ بانٹ کر دیا۔ بلنتو کے میکے کے دیے ہوئے برتن بھی آدھے سے زیادہ انھوں نے اپنے پاس رکھ لیے گیالا خاموش رہا۔ بلنتو اُسے دیے ہوئے قول پہ قائم رہی اور دونوں صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

اب ان کو صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے گیارہ برس ہو چکے تھے۔ بارھواں سال شروع تھا۔ وہ بارھواں سال جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بدنصیب کی بھی سنی جاتی ہے۔ اُن کا نیم شکستہ گھر ویسے کا ویسا تھا۔ پکّی تو کیا وہ کوئی کچّی اینٹ تک نہیں لا سکے تھے۔ اور جو کھرلی تھی اس میں جون اور جولائی کی دھوپ سیدھی مویشیوں پر پڑتی تھی۔ کھرلی پر پڑا ہوا چھپر بھی یوں ہی سا تھا جو دھوپ سے مویشیوں کو بچانے کے بجائے خود گرمی سے ہو نکنے لگتا تھا۔ عقبی کوٹھڑی برسات میں پانی سے بھر جاتی تھی۔ بلنتو اپنی استعداد کے مطابق سارے گھر کو سنوارتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی محنت سے تو پرانی دیواریں اور لکڑیاں نئی نہیں بن سکتی تھیں۔ الگ ہو کر نہ انھوں نے کوئی بھاری بھینس خریدی اور نہ کوئی توانا بیل خریدا تھا۔ چھکڑے کے نئے پہیے بھی نہیں لگوائے تھے۔ پتیاں لگوا کر اکھڑے اور ڈھیلے چھکڑے کو ٹوٹی جوتی کی طرح گیالا گھسیٹتا رہتا تھا۔ اور لوگ ٹھٹھا اُڑاتے ہوئے ان کے چھکڑے کو۔ "نگوڑی گاڑی!" کہنے لگے تھے۔

ان گیارہ سالوں میں وہ ساس سُسر اور دیور دیورانی کی جلی کٹی سُنتی رہی تھی اور اُس نے گیالے کے قول کی پھنسائی ہوئی کریر کے پیڑ کی گلی ٹوٹنے نہیں دی تھی۔ اس کے ساتھ چھوٹی موٹی بہت سی چیزیں چپکتی رہتی تھیں اور پانی کا نکاس بالکل بند ہو گیا تھا۔ اور اس کا باطن اتنے برسوں سوکھے کی وجہ سے خشک دھرتی کی طرح پھٹ چلا تھا۔ اور پانی کا دھارا کبھی کبھی اتنا زور مارتا کہ کریر کے پیڑ کی گلی ٹوٹنے لگتی۔

خیر وہ جو کہتے تھے سو کہتے تھے لیکن بنا کسی بات کے اُس کی سوت جیسی دیورانی بھی اُس پر

آوازے کسنے سے باز نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کس گئے گزرے گھر کی وہ آئی تھی کہ جوں جوں بلنتو کی حالت پتلی ہوتی جارہی تھی وہ زیادہ مچلتی جارہی تھی۔ جب بلنتو کا کوئی بچہ کسی چیز کے لیے رونے لگتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی۔ گیالا اور بلنتو جب اونچا بولتے تو اسے بڑی تسکین ہوتی۔ دیوار سے کان لگا کر وہ بھنک لیتی اور پھر رائی کا پہاڑ بنا کر اڑوس پڑوس میں پھیلا دیتی۔

پہلے پہل بلنتو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کی دیورانی کو اُس سے کیا دشمنی تھی۔ ایک دن اس کی دیورانی کا باپ تازہ بیاہی بھینس ان کے گھر باندھ گیا اور جب ان کی پڑوسن بچنتی کی بہو نے اس کو آکر مبارک باد دی تو سیدھا جواب دئے بغیر اُس نے دیوار سے ٹیڑھی آنکھیں کر کے جھانکتے ہوئے بلنتو کو سُنایا "یہ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ سات بھینسیں ہتھنیوں کی طرح کھڑی تھیں۔ باپو (باپ) نے کہا :- 'میری بچی — جو جی میں آئے لے جاؤ — ہاتھ میں لوٹا لے کر لسی کے لیے گھر گھر کی ٹھوکریں تو نہیں کھاؤ گی"

اس وقت بات بلنتو کی سمجھ میں آگئی تھی۔ دیورانی کو اپنے میکے کی امارت کا غرور تھا۔ سسرال میں بھی اس کی عزت کی وجہ یہی تھی۔ اس لیے وہ بلنتو کو حقیر سمجھتی تھی۔

بلنتو کے دل میں اس وقت پہلی بار یہ خیال آیا "اگر وہ بھی کھاتے پیتے ماں باپ کی بیٹی ہوتی تو دیورانی کے برابر کی بھینس لا باندھتی پھر یہ طعنے اُسے برداشت نہ کرنے پڑتے" لیکن اس کے میکے والے تو اُسے تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا دینے کے قابل بھی نہیں تھے۔ اُس وقت اُسے اپنی غریبی بہت بھیانک معلوم ہوئی۔

پھر پانی دن پہ دن چڑھتا رہا۔ سیلاب کی قوت سے زیادہ زور آزمانے لگا۔ لیکن اس کے حلق میں کھٹکتی پھانس نہ نکلی۔ اور بلنتو کے باطن کی دھرتی اور زیادہ چٹخنے لگی۔ گھاس کی جڑیں بھی ٹوٹنے لگیں۔

بلنتو دن بھر نڈھال اور مضمحل پڑی رہی۔ دن ڈھلے جب گیالا گھر واپس آیا تو اُسے چارپائی پر پڑا ہوا دیکھ کر اُس کے کلیجے پر چھری سی چل گئی۔ چار پہروں میں بلنتو کا رہا سہا رنگ روپ بھی سوکھ گیا تھا۔ آنکھیں اور زیادہ گہری ہوگئی تھیں اور اس کی آنکھیں نیچے سے یوں معلوم ہوتی تھیں جیسے وہاں کالک مل دی گئی ہو۔ اُس کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں ہلدی کی طرح زرد ہو گئے تھے۔

گیالا خفیف سا ہو کر کھرلی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر میں اور اس کی کمر میں بڑا درد تھا۔ اُس نے نظریں جھکا کر پھاوڑے کے دستے پر سر رکھ دیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ ایک خواب کی طرح اسے بلنتو کے خدوخال کا خیال آیا جن کے جلال کی آج سے چودہ سال پہلے تاب نہیں لائی جاتی تھی۔ دودھ جیسے سفید موی کاغذ کی اُس گڑیا جیسی عورت پر وہ زور سے ہاتھ بھی نہیں ڈالتا تھا کہ کہیں وہ میلی نہ ہو جائے۔ کہیں کچلی اور

اور مسلی نہ جائے۔

جب اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اسے سامنے بال بکھرائے ماگھی نظر آیا۔ وہ نشے میں چور جھول رہا تھا۔ گیالے کو کھرلی پر اُداس بیٹھا دیکھ کر اُس نے ایڑیاں اُٹھا کر اُدھر دیکھا تو طنز سے بلند آواز میں بولا۔ "اے زن مرید اس وقت کس رنگ میں ہو؟" اُس کی آواز کھردری اور سنگدلی سے بھری ہوئی تھی۔

گیالے نے کبھی اس سے زیادتی کی بات نہیں کی تھی۔ اسے الگ ہوئے گیارہ برس ہو چکے تھے۔ کئی بار اُس کے خود سر شرابی بھائی نے برا بھلا کہا تھا۔ طعنے دیئے تھے۔ چبھتی ہوئی باتیں کہی تھیں، بلنتو کو براہِ راست گالیاں دی تھیں لیکن گیالا آگے سے کبھی نہیں بولا تھا۔ سب کچھ پانی کی طرح پی کر گھر کے اندر چلا جاتا تھا۔ عقبی کوٹھڑی کے سایہ تلے بلنتو نے جب گیالے کو یوں اندر گھستے دیکھا تو گیارہ برس کی خشک سالی سے اس کا تڑخا ہوا باطن جھلسا گیا۔ جیسے سورج کی تمام آگ اُس پر برس رہی ہو۔

بلنتو اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن دیور کی جگہ شراب میں دھت اس کا سُسرا اسے دکھائی دیا۔ (ماگھی ہنس کر ایک طرف ہٹ گیا) اس نے اپنی مردہ آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ یم راج کے ان دوتوں کی طرف دیکھ رہی ہو جو اُسے لے جانے کے لیے آئے تھے۔ اس کو اس بات کا دھیان ہی نہ رہا کہ وہ اپنے سسر کے سامنے کبھی کھلے منہ نہیں بیٹھی تھی۔ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا اور اُس نے ابھی تک وہ دوپٹہ اپنے سر پر نہیں لیا تھا۔

اور پھر کریر کی گلی کٹ گئی۔ دندناتا ہوا سارا پانی موکھے میں سے ٹونٹی اور گلی اور اس سے لپٹے جھاڑ جھنکار سمیت سیلاب بن گیا اور اُس کے جھلسے ہوئے باطن کی دھرتی کی پتھریلی دراڑیں اور بھی چیخ گئیں۔

"تیری ....." اس کے سسر نے اُسے یوں ننگے سر بیٹھے ہوئے دیکھ کر بلند آواز میں کہا "تو نے تو ہمیں کنجر بنا دیا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اندر دبا دوں گا۔ کسی کو تیری ہوا بھی نہیں لگے گی۔ کہیں تو کسی وہم میں ہو۔"

لیکن آج بلنتو کو اپنے سُسرے پہلے کی طرح خوف نہ آیا۔ اُس نے دوپٹہ بھی اُٹھا کر سر پہ نہ لیا۔ اُس نے نظریں بھی نہ جھکائیں۔ وہ سسر کی طرف گھور کر دیکھتی رہی۔

"کیا بات ہے؟" باپ کو گالیاں دیتا سُن کر ماگھی نے نزدیک آ کر مخمور آواز میں باپ سے پوچھا۔

"یہ دیکھ چھنال نے ہمیں کیسے رسوا کیا ہے۔ سب کرتوتیں کر چکی ہے۔ اب یہی کسر باقی رہ گئی

تھی۔ یہ بھی پوری کر لی۔ کس طرح بیسوا کی طرح بے شرم ہو کر بیٹھی ہے۔ مجھے ذرا گنڈاسہ پکڑا۔ میں عمر بھر کے لیے یہ ٹنٹا ہی ختم کیے دیتا ہوں۔"

"تم کیوں اس بڑھاپے میں کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاتے ہو۔ یہ ثواب مجھے کمانے دو۔ ہمارے بھائی کا بھی کلیان ہو جائے گا..... یہ جونک آج اس کے گلے سے اُتار ہی دیں۔" ماگھی کھلے بالوں کا جوڑا کرتے ہوئے للکارا۔

... اور پھر کھرلی پر چڑھ کر اُس نے دیوار کے اوپر سے نیچے چھلانگ لگائی اور بلنتو کے دالان میں آ پہنچا۔ بلنتو کا سسر بھی گالیاں دیتا ہوا گلی میں سے اندر چلا آیا۔ شور سُن کر گیالا اندر سے نکلا، اور راکشسوں کی طرح آتے ہوئے اپنے باپ اور بھائی کو دیکھ کر سہم گیا۔

لیکن کریر کے پیڑ کی گلی ٹوٹ چکی تھی۔

بلنتو ان کے نزدیک آنے سے پہلے ایک نعرہ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے ویسے ہی ننگے سر ایک کونے میں پڑا ڈنڈا اُٹھا لیا اور کلکاری مارتے ہوئے چیخی۔

"آؤ۔ کون میرے باپ کا سالا میرے نزدیک آتا ہے۔ اگر کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو اس کی اور اس کے حواریوں کی آنتیں باہر نکال دوں گی۔"

وہ اتنی زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز پہچانی نہ گئی۔ بچے ڈر کے مارے دیواروں کے ساتھ جا کھڑے ہوئے اور ڈھائیں مار کر رونے لگے۔ گیالے کا باپ اور ماگھی بھی سہم سے گئے۔ ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا یہ وہی عورت تھی جو بارہ سال تک کان لپیٹ کر ان کی جوتیاں کھاتی رہی تھی۔ کڑوے بول اور گالیاں سنتی رہی تھی۔ اور اس نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا اور اب کالکا مائی کا روپ دھار کر ڈنڈا اٹھائے دو آدمیوں کے مقابلہ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ یہ ان دونوں کی مخمور آنکھوں کو بھی کچھ خلافِ معمول نظر آ رہی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مخمور آنکھیں سوچے سمجھے بغیر اور زیادہ غضب آلود ہو گئیں اور وہ دونوں باپ بیٹے اس "چھنال عورت" کو بھیڑیے کی طرح چیرنے پھاڑنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔

"بلنتو۔" گیالے نے چلا کر کہا اور اس کی طرف دوڑا۔ لیکن بلنتو۔ اب وہ بلنتو کہاں تھی۔ بلنتو اب کہیں نہیں تھی۔ گلی ٹوٹ چکی تھی۔

گیالا ابھی اُس کے نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ بلنتو نے اپنی طرف آتے ہوئے ماگھی کی جانب سرِ میدان دوڑ کر ڈنڈا اس کے دائیں کندھے پر اتنے زور سے مارا کہ ماگھی کا بازو ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لٹکنے لگا۔

اُس کا سُسر آگے بڑھا تو وہ ماگھی کو چھوڑ کر اس پر جھپٹ پڑی اور جب گیالے کے باپ پر ڈنڈے کی ضرب پڑی تو وہ گالیاں دیتا پیچھے مڑ گیا اور کوئی ڈنڈا ڈھونڈنے کے بہانے دالان میں آگیا۔ جب تک گیالا دوڑتا ہوا بلنتو کے نزدیک پہنچا تب تک وہ گتکے کے کھلاڑی کی طرح اُلٹے پاؤں نعرے لگاتی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اور اُس نے دیوار سے لگے ہوئے پہلے کی طرح للکار کر کہا۔

"اب میرے نزدیک تمہارا کوئی سگا آکر تو دیکھے ....تم نے چودہ برس تک میرا دل جلایا ہے۔ اس لیے کہ میں عورت ذات تھی۔ اب آؤ میرے نزدیک تمہارا خون نہ پی جاؤں تو...... لے آؤ اُس رئیس کی بیٹی کو بھی جو آئے دن ماں باپ کے گھر سے ہتھنیاں لاکر یہاں باندھتی ہے۔ غلاظت کے بھوکو۔ بڑے مرد بنتے ہو۔ اب ذرا کنگالوں کی بیٹی کے نزدیک آکر دیکھو.... میں چودہ برس تک تمہاری جلی کٹی سنتی رہی ہوں۔ تم مجھے غریب جان کر میرا انگ انگ نوچتے رہے۔ آؤ۔ اب نزدیک آؤ۔ بڑے مرد بنتے ہو۔ اب ذرا عورت کے ہاتھ تو دیکھو.... خون پی لوں گی۔" اُس کا چہرہ چشم زدن میں یوں لال بھبوکا ہو گیا تھا جیسے وہ واقعی خون پی کر ہٹی ہو۔ کوئی بھی ڈرتا ہوا اُس کے نزدیک نہ گیا۔

شور سُن کر سارا پڑوس وہاں جمع ہو گیا تھا۔ جب لوگوں نے بلنتو کو ننگے سر سب کے سامنے یوں ڈنڈا اٹھائے اور واہی تباہی بکتے دیکھا تو بہت سے لوگوں نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔ کچھ لوگ جو گیالے کے باپ اور ماگھی سے خار کھاتے تھے یہ منظر دیکھ کر مسکراتے رہے۔ اندر نمبردار جس نے اپنی ساٹھ برس کی عمر میں اتنی بے حیا عورت کبھی نہیں دیکھی تھی شرم اور غصے کے مارے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ وہ ایک عورت کو اس طرح گالیاں دیتے ہوئے برداشت نہ کر سکا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے اپنی سرداری کا رُعب ڈالتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"چپ کرتی ہے کہ نہیں ـــ! چھنال اور چڑیل کیسی مستی میں آئی ہوئی ہے۔"

اور جب وہ ذرا سا آگے بڑھا تو بلنتو نے ایسے ہی چلا کر کہا۔

"بابا دیکھنا ـــ کہیں مفت میں پگڑی نہ اُتروا لینا ـــ اپنی نمبرداری اپنے پاس رکھ ـــ جب یہ مجھ پر ظلم توڑتے تھے اُس وقت تو بڑا سرپنچ کہاں تھا۔ کیا اسی گاؤں میں رہتا تھا کہ کہیں اور ...."

نمبردار نے اپنی زبان دانتوں تلے دبا لی۔

اور پھر اچانک پانسہ ہی پلٹ گیا۔ اِندر نمبردار حواس باختہ گیالے پر برس پڑا۔ "سالے کیا تُو بھی کوئی مرد ہے۔ تو نے اس بندریا کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔ اس بھیڑ کی خاطر تو سارے گاؤں کی عزت خاک میں ملا رہا ہے ـــ کتے ـــ تجھے شرم نہیں آتی؟"

اور لوگ دل ہی دل میں بلنتو کو چھوڑ کر گیالے کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے۔ چوہے کے پیچھے پڑی ہوئی چیلوں کی طرح لوگوں نے اُسے دبوچ لیا۔

"سالا مرد بنتا ہے۔"

"اس کی اپنی کمزوری نہ ہو تو عورت کی کیا مجال جو اتنی سر چڑھ جائے۔"

"اگر میری بیوی اس طرح کرتی تو میں اس کے ٹکڑے کر کے اندر دبا دیتا۔"

"عورت کی کیا مجال جو منہ سے لفظ تک نکال سکے۔ بال پکڑ کر سر میں چار جوتیاں مارو تکلے کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔"

گیالے کو گالیوں کی طرح یہ کڑوے بول سنائی دیتے رہے۔ لیکن اُسے یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوا۔ "عورت" کا لفظ سن کر اُس کی حالت ایسی ہو جاتی تھی جیسے سینکڑوں آدمی اس کے بازو پکڑ کر رسّہ کشی کر رہے ہوں۔ بلنتو وہ عورت تھی جس نے اس کے لیے اپنی ہر بات چھوڑ دی تھی۔ اس کے لیے اپنی کایا بھی خاک میں ملا دی تھی۔ اور کبھی کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی جان ہی بلنتو میں تھی۔ جیسے قصہ کہانی والے راجہ کی جان پیپل سے لٹکے ہوئے پنجرے کے طوطے میں تھی۔ یہ لوگ عورت سے کیا کہہ رہے تھے گیالے پر غشی سی طاری ہو گئی۔ وہ بالکل بدحواس ہو گیا۔

آخر کار کچھ بزرگ دور کی سوجھ کر ماگھی اور اس کے باپ کو زبردستی وہاں سے لے گئے۔ ہر ایک نے بلنتو اور ہیجڑے گیالے کو جو جی آیا گالیاں دیں اور آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔ دالان کا شور سارے گاؤں میں پھیل گیا لیکن بلنتو ابھی تک ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

گیالا بھیگی بلی بنا ہوا اندر جا گھسا۔ اُسے پتہ نہ چلا کہ اندر قدم رکھتے ہی وہ کب مسکرا پڑا تھا۔ اور اس کی اس بیگانی مسکراہٹ کو شام کے دھندلکے میں دیکھ کر بچے اور زیادہ سہم گئے اور خاموش ہو گئے۔

...اور پھر اس وقت باہر اُسے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی جیسے آندھی میں خشک پیڑ کی کوئی شاخ گر پڑی ہو۔ وہ باہر دوڑا۔ بلنتو اوندھے مُنہ گری پڑی تھی۔ وہ اسے بازوؤں میں اُٹھا کر اندر لے آیا۔

...اور اس کے بعد ساتویں دن لوگوں نے یہ سنا کہ بلنتو مر گئی۔

اجیت کور

سُولی پر لٹکے ہوئے لمحے

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو کرونا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج کا دن وہ لینوں کے ساتھ کیسے گزارے گی۔ اتوار تھا۔ کرونا کا دل بستر پر سے اُٹھنے کو نہیں چاہتا تھا۔ ایک عجیب نیم بے ہوشی سی، ایک عجیب بے حسی سی اس کے انگ انگ پر کائی کی طرح جم گئی تھی۔

کتنی ہی راتیں بیت چکی تھیں۔ اُسے گہری نیند نہیں آئی تھی۔ ہر روز صبح جب وہ بستر پر سے اٹھتی تھی تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ رات بھر میلوں مسافت طے کرتی رہی تھی۔ صبح سویرے جب لوگ پھول کی طرح ہلکے ہو کر جاگتے ہیں تو وہ منوں بھاری تکان سے لدی ہوئی جاگتی ہے۔

..اور آج رات تو نیند اُسے بالکل نہیں آئی تھی۔ منہ اندھیرے اُس نے مرغوں کو بانگ دیتے سنا تھا۔ چپکے سے اُٹھ کر وہ لینوں کی چارپائی پہ جا کر لیٹ گئی تھی اور اُسے سوئی پڑی دیکھتی رہی تھی۔ پھر اُس نے اُس کے چھوٹے سے گول رخسار کے ساتھ اپنا گال جوڑ دیا تھا اور نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح بیدار ہوئی تو کرونا سوچنے لگی۔ آج کا دن وہ کیسے بِتائے۔ کیا سوئی رہے؟ یا اُٹھ بیٹھے؟ دیر تک وہ یوں ہی لیٹی رہی۔ لینوں کے ہموار سانسوں کی آواز سنتی رہی۔ اُس کی نوکرانی نے جب چائے کا گرم گرم پیالہ اس کے قریب کی چھوٹی میز پر رکھ دیا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بی بی — آج کا بات ہوئی — اُٹھو گی نہیں؟"

"کچھ نہیں کٹوریا — بس آج اتوار ہے نا۔"

"آج اتوار ہے — کل سوموار — اور سوموار صبح ہوتے ہی ..."

"بس — بس — کچھ نہ سوچو — کچھ نہ سوچو" اُس کے اندر کوئی چیخ اُٹھا۔ اُس نے چائے کا پیالہ ختم کرنے کے بعد اُسے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سر میں آندھی کے چلنے کا شور ہے۔ گرد و غبار ہے۔ دُور سے

کسی کے حامی بھرنے کی آواز آرہی ہے۔ لیکن دکھائی کچھ نہیں دیتا۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

آج اتوار ہے — کل سوموار — اور سوموار صبح ہوتے ہی....

کرونا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ کل دس بجے کے بعد کسی وقت بھی — کسی وقت بھی — ہاں — اصل میں تو ساڑھے پچیس گھنٹے ہی ہوئے نا — ؟

اور کرونا نے لینوں کے منہ کی طرف دیکھا۔ لینوں کی کالی لمبی اور ریشمی پلکیں اُس کے گول رخساروں پر ہلکی سی چھاؤں کر رہی تھیں۔ اُس کے بالوں کی دو تین گھنگریالی لٹیں اس کے ماتھے پر ڈھلک آئی تھیں۔ کرونا کو مسز دیوان کی بات یاد آگئی — "ہائے — اگر تمہاری بیٹی چھ سات سال اور بڑی ہوتی تو اسے اپنے للت کی بہو بنالیتی۔ لینوں بیٹی سات آٹھ سال پہلے کیوں نہ پیدا ہوئی؟"

لینوں شرما کے کہا کرتی — "پتہ نہیں آنٹی — یہ تو میری ممی جانتی ہے — بتاؤ ممی"

خبر نہیں کیا تھا — مسکراہٹ تھی یا کوئی آنسو تھا یا کوئی آہ تھی — جو کرونا کے حلق میں آکر اٹک گئی تھی۔ کرونا نے ایک خالی گھونٹ بھرا۔ حلق سے نیچے کسی چیز کو اُتارنے کی کوشش کی۔

کرونا بے خیالی کے عالم میں اخبار دیکھنے لگی۔ سپر وہاؤس میں بچوں کی دو بہت ہی اچھی فلمیں لگی ہوئی تھیں "ہاں — یہ ٹھیک ہے — لینوں کو لے جاؤں گی — پھر پتہ نہیں"

کرونا نے لینوں کو جگا دیا — اُسے تیار کیا۔

لینوں نے کہا "ممی — کون سی فراک پہنوں؟"

کرونا نے الماری کھول دی — لینوں کی فراکیں، اسکرٹ اور بلاوز ہینگروں پر ٹنگے ہوئے تھے۔ کرونا کے اپنے کپڑے تھوڑے سے ہی تھے۔ باقی تمام لینوں کے تھے۔ کرونا نے کہا "جو تمہیں پسند ہو پہن لو"

لینوں کے چہرے پر ایک ہلکی سی پرچھائیں پڑی۔ اُس نے اپنی ماں کے منہ کی طرف دیکھا — کرونا دوسری طرف دیکھنے لگی۔ دو قدم اُدھر ہٹ کر میز پر پڑی ہوئی ایک کتاب یوں ہی سیدھی کر کے رکھنے لگی۔ پیچھے ہوتی ہوئی کھٹ پٹ سے اُس نے اندازہ لگا لیا کہ لینوں ہینگر پر سے کوئی کپڑا اتار رہی تھی۔ کرونا نے دیکھا۔ اُس نے کالا شیشوں والا اسکرٹ اتارا تھا اور گہرے پیلے رنگ کا ہینڈلوم سلک کا بلاوز۔

لینوں کپڑے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دنوں سے اب وہ کرونا کے سامنے کپڑے تبدیل نہیں کیا کرتی تھی۔ کرونا سوچتی — لینوں کو بھی یہ احساس ہو رہا ہے کہ

وہ بڑی ہوتی جا رہی ہے ۔ پگلی ۔ اسے ماں سے بھی شرم آنے لگی ہے ۔ اور کرونا کے لیے اس لمحے کا اضطراب ذرا کم ہو گیا ۔

کرونا ابھی اُسی طرح میز کے قریب کھڑی تھی کہ لینوں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد آ گئی ۔ آج کرونا کو وہ پہلے سے بڑی معلوم ہوئی ۔ پہلے سے زیادہ لمبی نظر آئی ۔ کٹوریا میز پر چائے رکھ گئی تھی ۔ کرونا نے کہا "لینوں ۔ دو کپ جلدی سے بناؤ ۔ میں آتی ہوں" وہ جیسے لینوں سے اپنے چہرے پر پیدا پرچھائیاں چھپانا چاہتی تھی ۔

میز پر بیٹھی کرونا اپنے پیالے میں چمچہ ہلا رہی تھی اگرچہ وہ جانتی تھی کہ آدھا چمچہ کھانڈ کبھی کی گھل چکی تھی ۔ لینوں پراٹھا اور مکھن کھا رہی تھی ۔ اچانک کرونا کو یوں لگا جیسے لینوں بھی پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے پر کوئی پرچھائیں پیدا نہ ہونے پائے ۔

کرونا کو یوں لگا جیسے لینوں چند ہی روز میں کافی بڑی ہو گئی تھی ۔ اس کے برابر ہو گئی تھی ۔ برابر کی دو لڑکیاں ۔ وہ برابر کی دو عورتیں تھیں ۔ ایک لفظ تھا جسے وہ دونوں جانتی تھیں لیکن اُسے ہونٹوں سے ادا نہیں کر رہی تھیں ۔ اور دونوں ایک دوسرے کا دل رکھنے کے لیے معصوم سی اداکاری کر رہی تھیں ۔

"لینوں ۔ مکھن اور لیلو"

"دیدو ممی ۔"، وہ جیسے ماں کو خوش کرنے کے لیے مکھن کھا رہی تھی ۔

"لینوں کیا تمہارے پیالے میں اوولٹین ڈال دوں ؟

"ڈال دو ممی"

کل کچھ پتہ نہیں ..... اس سے آگے سوچنے کے لیے کرونا نے بہت زور سے اپنے آپ کو روکا ۔

دونوں تیار ہو کر سپرو ہاؤس پہنچیں ۔ کرونا ہال کے اندھیرے اور فلم کی احسان مند تھی ۔ اندھیرا اور فلم اُن ساڑھے پچیس گھنٹے کی خلیج کو کچھ پُر کر رہے تھے ۔

فلم کے بعد وہ کوئینز وے گئیں ۔ کرونا نے لینوں کو جے پور کی موتی جڑی موٹی موٹی چوڑیاں لے دیں ۔ کہانیوں کی ایک کتاب لے دی ۔

"لینوں کیا کھاؤ گی ؟"

"کچھ نہیں ممی"

لیکن لینوں نے جب یہ کہہ کر اپنی ماں کے مُنہ کی طرف دیکھا تو نہ جانے اُس کے چہرے پر کیا

تھا۔ لینوں فوراً بول اٹھی "ممی — کیا مجھے کوالٹی لے چلو گی؟ ڈبل سنڈے کھاؤں گی"

لینوں نے 'ڈبل سنڈے' لیا اور کرونا نے کافی کا کپ۔

ایک انوکھی سی خاموشی میز پر اور میز کے ارد گرد منڈلاتی رہی — وہ بے مطلب لوگوں کی طرف اور ادھر اُدھر دیکھتی رہیں۔

شام ہو چلی تھی۔ کناٹ پلیس کی چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ تھوڑا سا چل کر کرونا نے لینوں سے پوچھا "اب گھر چلیں یا کہیں اور"

لینوں نے ذرا سا سوچ کر کہا "ممی میں رجنی سے مل لوں"

کرونا چونک پڑی — "مل لوں" — تو کیا اُسے بھی ڈر تھا کہ کہیں — کہیں — کرونا نے اپنے آپ کو سنبھالا "ہاں — ہاں — ضرور — ابھی چلتے ہیں"

رجنی جب لینوں کو اپنے کمرے میں لے گئی تو رجنی کی ماں نے بڑی رازداری سے کرونا کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ ..."

کرونا کو اس قسم کی رازداری اور ہمدردی سے بہت چڑ تھی۔ کسی کے سامنے اپنا دکھ جتانا اور راہ چلتے کسی بھکاری کا اپنا برص زدہ ہاتھ دکھانا اس کے نزدیک برابر تھا۔

اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے اُٹھ جائے۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے فوراً رجنی کی ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہاں کل فیصلہ ہوگا"

"کیا کل تاریخ ہے؟" رجنی کی ماں بات کو شروع کرنے کے بعد ختم نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

"ہاں کل" کرونا نے کچھ اس طرح کہا کہ رجنی کی ماں کو اس سے آگے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اندھیرا پھیل رہا تھا — سردی بڑھ رہی تھی — کرونا نے لینوں کو آواز دی "بیٹا — کیا اب واپس چلیں؟"

"ہاں ممی — میں تھک گئی ہوں" اچانک لینوں کو تکان محسوس ہوئی۔

ان کے گھر پہنچتے تک رات ہو گئی۔

کٹوری نے پوچھا "بی بی — کیا روٹی بنا دیں؟"

"تم چولھے پر توا رکھو — میں آتی ہوں کٹوریا"

کرونا نے روٹیاں خود بنائیں۔ نرم — گول اور پھولی ہوئی۔ ان کو مکھن سے چپڑ دیا۔ روٹیاں

بناتے ہوئے اُس کے اندر نہ جانے کیا کچھ بل کھا رہا تھا۔ جیسے جب وہ چھوٹی سی تھی تو کرونا کے والد اس کے دانت صاف کرنے کے وقت "داتون کو مروڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیا کرتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد لینوں چپ چاپ اپنی رضائی میں گھس گئی۔

چپ ایک بھاری سِل تھی۔ ایک بہت بڑی چٹان تھی۔ جس کا بوجھ جیسے سارے کا سارا کرونا کے سینے پر آ پڑا تھا۔

"بیٹا لینوں — تم نے کیا ہاتھوں پر کریم لگائی ہے؟" کرونا نے جیسے اُس چٹان کو توڑنے کی کوشش کی۔

"اوہ — ممی — وہ تو میں بھول ہی گئی —" لینوں نے ایک دم رضائی میں سے نکلتے ہوئے کہا۔ جیسے سب سے ضروری کام وہ تھا جسے وہ بھول گئی تھی۔

"ٹھہر جاؤ — میں دیتی ہوں" کرونا نے الماری میں سے کریم نکال کر لینوں کو تھما دی — وہ جیسے اس یاد آئے ہوئے کام کی ممنون تھی جس نے لمحات کے تناؤ کو کم کر دیا تھا۔

ہاتھوں پر کریم لگا کر لینوں لیٹ گئی — اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

کرونا نے بتی بجھا دی، اور وہ بھی لیٹ گئی۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔

ساتھ کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو" کرونا نے رسیور اُٹھایا۔

"ہیلو — کرونا — تم کیا کر رہی تھیں؟"

"اوہ — توشی — کچھ نہیں — بس یوں ہی لیٹی ہوئی تھی"

"میں نے شام کو بھی تمہیں فون کیا تھا — تم گھر پر نہیں تھیں۔

"ہاں — میں اور لینوں ذرا باہر گئی ہوئی تھیں"

"لینوں کہاں ہے؟"

"اچھا — بس — میں نے سوچا کہ پوچھوں کہ تم کیا — کیا — کر رہی ہو"

"اوہ توشی —" کرونا کا جی چاہا کہ توشی اُس سے یہ اداکاری نہ کرے۔ توشی اُس کی بڑی پیاری اور گہری سہیلی تھی۔

"کرونا — کیا میں تھوڑی دیر کے لیے آجاؤں؟" توشی جیسے التجا کر رہی تھی۔

"آجاؤ ــــ" کرونا نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔ ہر تکلیف کے دوران اُسے تنہا رہنا پڑتا تھا۔ لیکن توشی کی بات اور تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد توشی آ گئی۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" کرونا نے پوچھا۔

"ڈرائیور ہے ــ گاڑی نیچے کھڑی ہے۔"

"دونوں خاموش رہیں۔

"کافی کا ایک کپ پیو گی؟" کرونا نے پوچھا۔

"اس وقت کوئی ضرورت نہیں۔" توشی کے حلق میں کچھ اٹک رہا تھا۔

"ایک گرم گرم کپ کے لیے میرا جی چاہ رہا ہے۔" کرونا نے کچھ نہ کچھ کرنے کی غرض سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔"

کرونا نے بجلی کی کیتلی اٹھائی اور اسی کمرے میں پلگ لگا دیا اور دیوان پر بیٹھ گئی۔

توشی نے ایک لمحہ کے لیے کرونا کی طرف دیکھا اور پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ایسے وقت میں کوئی کسی سے کیا کہے؟ اُس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اُسے دھیرے دھیرے باہر نکالنے لگی تاکہ کرونا اس سانس کی آواز نہ سن لے۔

اُس بھاری اور دشوار خاموشی میں دونوں کو کیتلی میں کنمناتے ہوئے پانی کی آواز سُنائی دینے لگی۔ کرونا جانتی تھی کہ پانی ابھی اُبلا نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اُٹھی اور اس نے کیتلی کا ڈھکن اتار کر اس کے اندر جھانک کر دیکھا۔ کیتلی کے پہلوؤں سے پانی کی بوندیں چھوٹے چھوٹے موتیوں کے دانوں کی طرح پروئی جا رہی تھیں۔ کرونا نے اس پر دوبارہ ڈھکن رکھ دیا۔

"سردی میں کافی کا گرم پیالہ بھی راحت بخش ہوتا ہے۔" کرونا نے کہا۔

"اب تو میرا بھی جی کافی کو چاہ رہا ہے۔" توشی نے کہا۔ ویسے کافی کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔

کرونا رسوئی سے کپ لانے کے لیے گئی۔ توشی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ کافی تیار ہو گئی۔ دونوں چپ چاپ اپنا اپنا کپ پکڑ کر کافی پینے لگیں۔

"کرونا کوئی بات کرو۔" توشی جیسے اس خاموشی سے گھبرا اُٹھی تھی۔

اچانک کرونا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس لمحے نہ جانے اُس کا سنگدل صبر و ضبط کیسے پگھل گیا تھا۔

کرونا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔ توشی نے ہاتھ بڑھا کر کرونا کی انگلیوں کو چھوا اور اُن پر آہستہ سے تھپکی دی۔

توشی اُٹھ کر باہر چلی گئی — کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ توشی نے واپس آکر کہا "میں نے ڈرائیور کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہے کہ میں رات یہاں رہوں گی۔"

کرونا کو اس بات سے نہ تسلی ہوئی اور نہ کوئی اُلجھن ہوئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ اپنے دامن میں پڑے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہی۔ توشی نے اس کا کپ اٹھا کر اسے تھما دیا اور اپنا کپ اُٹھا کر وہ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔

"میں اِس گھڑی سے اِن لمحوں سے اتنے برس تک ڈرتی رہی ہوں۔ اس لمحے سے ڈرتے ہوئے میں نے تیرہ برس اُس گھر میں کاٹ دئے جہاں میں ہر روز مرتی رہی۔ ہر روز مرتی رہی —" کرونا جیسے اپنے آپ سے زیادہ اور توشی سے تھوڑی باتیں کر رہی تھی۔

توشی خاموش تھی۔

"جب کبھی اس گھر کی دہلیزوں سے باہر جانے کا خیال آیا لینوں کی صورت میری آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی۔ اس گھڑی سے ڈرتے ہوئے میرے پاؤں بندھ جاتے۔"

"دیکھو کرونا — ایک بار ہمت کر کے تم نے قدم اُٹھایا ہے۔ اب حوصلہ کیوں ہارتی ہو۔"

"نہیں — توشی — میں نے دل تو بہت مضبوط کر رکھا ہے لیکن اس کے اندر کچھ توڑا مروڑا جا رہا ہے۔"

اُس نے اُٹھ کر کیتلی میں کچھ اور پانی ڈال دیا اور پلگ لگا دیا۔ اُٹھنے بیٹھنے سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بکھرتے ہوئے خیالوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔

"کیا تم وکیل سے ملی تھیں؟"

"نہیں — کل ملی تھی۔"

"کیا کچھ کہتا تھا؟"

"بچہ ماں کو دیا جائے یا باپ کو — یہ جج کی مرضی پر ہے۔ جسے وہ ٹھیک سمجھے۔"

"جہنم میں جائے قانون — کیا بچے پر ماں کا حق نہیں؟ بچے کو جنم دے ماں — اے پالے ماں — دکھ جھیلے ماں —" توشی جھنجلا رہی تھی۔

اور کرونا کو جھیلے ہوئے تمام دکھ یاد آرہے تھے۔ اُس نے کیسے لینوں کی پرورش کی تھی — کیسے

وہ باپ اور ماں دونوں کا پیار اکیلی ہی اسے دیتی رہی تھی۔ کیسے آنند کے دل میں بیٹی کے لیے ذرا سی بھی محبت نہیں تھی۔ شیر چیتے بھی اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن وہ آنند تھا کہ۔۔

"اس آنند کو بھی تنگ کرنے کا بس یہی طریقہ ملا۔ ڈھائی برس میں تم نے مشکل سے یہ گھر بنایا۔ لینوں بھی سیانی ہوگئی ہے۔ اتنے سالوں کے بعد تمہیں ذرا سا چین نصیب ہوا تھا۔ اب اُس نے درخواست دائر کر دی۔ کہ بچی مجھے دی جائے ۔۔ کوئی پوچھے ۔۔ تمہیں اس کو پیار نہیں کرنا ۔۔ اسے پالنا نہیں ۔۔ اس پر کچھ خرچ نہیں کرنا۔ یہ درخواست صرف پریشان کرنے کے لئے .... اور نہیں تو کیا ۔۔" کرونا کی طرف دیکھتے ہوئے توشی کو آنند پر اور بھی غصہ آگیا۔ اُسے اور جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔

کیتلی میں پانی کے اُبلنے کی آواز آرہی تھی۔ کرونا نے اُٹھ کر دو کپ اور بنائے۔ اپنا کپ میز پر رکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ توشی نے تھوڑا سا اٹھ کر دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کرونا لینوں پر رضائی ڈال رہی تھی۔

کرونا واپس آئی تو اس کے چہرے پر اَن بہے آنسوؤں کا اتنا تناؤ تھا کہ اُس کے گال پھڑک رہے تھے۔ دیوان پر بیٹھتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپا لیا۔ اور سسک سسک کر رونے لگی ۔۔ توشی بھی دیوان پر آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے کرونا کے کانپتے شانوں کے گرد اپنا بازو لپیٹ دیا۔

"سوچتی ہوں کہ جج نے اگر لینوں آنند کو دیدی ..... اور وہ لینوں کو لے گئے تو .....

رات کو اس پر رضائی کون ڈالا کرے گا؟ "

توشی کا جی چاہا کہ وہ کہیں چھپ کر روئے ۔۔ اس کے حلق میں کچھ سُلگ رہا تھا ۔۔

کرونا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"اچھا ۔۔ توشی ۔۔ تم اس دیوان پر سو جاؤ گی نا؟" ویسے کرونا کو یہ معلوم تھا کہ جب بھی توشی رات کو اس کے پاس رہتی تھی تو دیوان پر ہی سویا کرتی تھی۔

توشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کرونا اندر سے ایک سفید چادر لے آئی ۔۔ ایک رضائی لے آئی۔ اس نے اپنا شب خوابی کا لباس توشی کو دے دیا اور خالی کپ ٹرے میں رکھ کر وہ رسوئی میں چلی گئی۔

بتی بجھا کر وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔

کرونا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ چاہتی کیا تھی ۔۔ یہ رات اتنی لمبی ہو جائے کہ

ختم نہ ہو—— یا فوراً ختم ہو جائے اور صبح ہو جائے —— فیصلہ ہو جائے —— یہ گھٹن دوَر ہو جائے —— وہ کچھ بھی نہیں چاہ رہی تھی —— وہ کسی بات کا انتظار نہیں کر رہی تھی —— وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔

رات کافی گزر گئی تھی۔ کرونا اُٹھی اور چپ چاپ لینوں کے ساتھ لیٹ گئی۔ لینوں کے رخسار پہ اُس نے آہستہ سے اپنے ہونٹ رکھ دئے۔

گلزار سنگھ سندھو

ٹھگی

جب کبھی نصیب آسام سے چھٹی پر آتا تو اپنے گاؤں میں جموں والی بے بے (بوڑھی عورت) سے ضرور ملتا۔ اور وہ بھی ایک ہی سانس میں اپنوں کے انبار لگا دیتی۔

"کب آیا میرے محل کا طوطا؟ اب کتنی نوکری باقی ہے تیری ــــ؟ پردیس میں رہنا تو قید کاٹنے کے برابر ہے۔ لیکن بُرا بھی کیا ہے؟ پیٹ کی خاطر دُنیا بہت کچھ کرتی ہے"

نصیب "ہوں ہاں" کر کے جموں والی کے تمام سوالوں کا یوں ہی سا جواب دے دیا کرتا۔ دراصل وہ اس کے پاس یہ باتیں کرنے کے نہیں جایا کرتا تھا۔ وہ تو صرف بات بنا ہنے کے لیے جاتا تھا۔ تاکہ اسّی سال کی وہ بڑھیا دل میں یہ نہ سوچے کہ فلاں کا بیٹا کام پر لگتے ہی علیک سلیک سے بھی جاتا رہا۔

جب وہ بے بے کے سوالوں کا جواب دے رہا ہوتا تو اس وقت اس کا ذہن آسام میں دریاؤں کے پُل بنانے کے لیے کھودے جا رہے کنوؤں کے چکر کاٹ رہا ہوتا۔ ٹھیکے دار سنت رام کے پاس نہ جانے کیا جادو تھا کہ ایک پُل تیار ہوتا اور دوسرے کا اسے ٹھیکہ مِل جاتا۔ ٹھیکے کے کام کے لیے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کی ضرورت ہوتی۔ سنت رام گاؤں کا ایک چکّر کاٹتا تو سب نوجوانوں کو کھدیڑ کر سینکڑوں میل دور لے جاتا۔ نصیب تو اس کے پہلے ٹھیکے ہی سے اس کے ساتھ تھا۔

ایک بار جب وہ اپنی بہن کی شادی پر گاؤں آیا تو اُسے پتہ چلا کہ جموں والی بے بے کو ادھرنگ ہو گیا ہے۔ کسی نے بتایا کہ بے بے کا ایک پہلو بے جان ہو گیا ہے اور وہ اپنے اُس پہلو کا ایک بھی انگ دوسرے پہلو کے انگ کی امداد کے بغیر نہیں ہلا سکتی۔ کیا ہوتی ہے بھلا چھنگلیا۔ لیکن اس کو حرکت میں لانا بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ دن رات ایک چارپائی پر پڑی رہتی، جو اس کے چاروں بیٹوں

نے بھوسے والی کوٹھری میں بچھادی تھی۔ اس کے بیٹے تو پہلے بھی اُس کے اتنے قابو میں نہیں تھے لیکن اب تو اُس کی بہویں بھی اس کی بات نہیں سنتی تھیں۔ بھوسے والی کوٹھری میں چارپائی پر پڑی ہوئی بے اس تاک میں رہتی تھی کہ چار بہوؤں میں سے کوئی ایک بہو اُدھر سے گزرے تو وہ اپنے دل کا سارا غبار اس پر نکال دے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جب سے وہ بیمار پڑی ہے گھر کا کوئی بھی کام اس طرح نہیں ہو رہا تھا جس طرح ہونا چاہیے۔ اُسے یوں لگتا کہ بھینس گائے کی کھرلی پر باندھ دی گئی ہے اور گائے بکری کے کھونٹے سے۔ کئی بار وہ سوتے میں یہ کہتی ہوئی سنی جاتی "اِن میمنوں کو مرغیوں والے ڈربوں میں کیوں ٹھونس رہے ہو۔ اور بڑے مرغ کے پیروں میں بکری کی زنجیر کیوں ڈال دی ہے" کوئی بڑی بات نہیں تھی اگر وہ یہ بھی سوچتی ہو کہ اُس کی چھوٹی بہو اُس کی بڑی بہو کی چارپائی پر جا پڑی ہے اور بڑی منجھلی کی چارپائی پر — لیکن وہ بے بس تھی —— سب کچھ جی ہی جی میں پئے جا رہی تھی۔

بے بے کے بیٹوں کو بے بے کی بیماری کا بہت دکھ تھا۔ کسی نے اُسے جنگلی کبوتر کھلانے کی رائے دی تو وہ دور و نزدیک کے تمام شکستہ کنوؤں سے کبوتر ایک ایک کر کے مار لائے۔ اگر کسی نے کوئی ٹیکہ بتایا تو انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ ٹیکے اس کے لگوائے۔ کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں چھوٹے موٹے خرچ سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ کسی کو یہ معلوم ہو جائے سہی کہ اتنی سی تگ و دو کرنے پر گھر سے آفت ٹل سکتی ہے۔ لیکن اب تو بے بے بھی یہ بات جان گئی تھی کہ اس کی بیماری کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس مایوسی کے باعث وہ پہلے سے زیادہ اُلٹی پلٹی باتیں سوچنے لگی تھی۔ جو باتیں اُس کی اپنی بہوؤں اور سچ پوچھو تو گاؤں کی تمام بہوؤں کے بارے میں اس کے سینے میں پڑی رہتی تھیں اب وہ کسی نہ کسی شکل میں باہر آنے لگی تھیں۔ گاؤں کا کوئی بھی آدمی اس کی مزاج پرسی کے لیے نہ جاتا۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں روٹی پانی اس کے سرہانے رکھ کر کھسک جاتے۔ اگر کوئی اُس سے بات بھی کرتا تو وہ ایسا آدمی ہوتا جو نصیب کی طرح کئی مہینے باہر رہ کر کبھی کبھی چھٹی پر آتا۔

نصیب نے جموں والی بے بے کے متعلق یہ سنا تو اُسے بہت رنج ہوا۔ ایک آدمی جو چل پھر کر ہر ایک کا حال پوچھ کر گہری نیند سویا کرتا تھا وہ کیونکر دن بھر چارپائی پر پڑا رہ سکتا ہے؟ کس کے ماتم میں بے بے سب سے آگے نہ ہوتی، کون سا ایسا کام تھا جس میں اُس کی رائے نہ لی جاتی۔ کون سی دیوار تھی جو اس کے مشورہ کے بغیر تعمیر ہوئی تھی۔ کون سا کنواں تھا جس کا کلس اُس نے اپنی آنکھوں سے ٹوٹتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ مربع بندی کے دنوں میں اسے چپہ چپہ زمین کی قیمت کا علم ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کنوئیں یا درخت کی جو قیمت لگائی گئی تھی وہ اس کے دل پر نقش تھی۔ یہ اُسی کی ہمت تھی

کہ اُس نے اپنے بیٹوں کو بڑھیا سے بڑھیا جگہ پر زمین لے کر دی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسکول کا ماسٹر کس لڑکی کی طرف دیکھتا ہوا گزرتا ہے یا گاؤں کے پٹواری کا کس گھر آنا جانا ہے۔ اس کے بیمار پڑنے سے پہلے جب پندرہ سال کے ایک جاٹ نے تیرہ سال کی جھیوروں کی لڑکی کو گھڑا اُٹھانے میں مدد دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اتنے بوجھ سے کہیں اس کی کمر نہ ٹوٹ جائے تو اور کسی کو خبر ہو یا نہ ہو جموں والی بے بے ضرور جانتی تھی کہ جھیوروں کی لڑکی نے جواب میں جاٹوں کے لڑکے کو گود میں اُٹھا لینے کا دعویٰ کیا تھا۔ اب جبکہ بے بے کو بیمار پڑے چھ مہینے ہو چکے تھے اُسے کیا پتہ تھا کہ جھیوروں کی اس لڑکی سے جاٹوں کا لڑکا اُٹھایا بھی گیا تھا کہ نہیں۔

نصیب کا دل بھر آیا۔ جب وہ بے بے سے ملا تو بے بے نے سینے میں چھ مہینے سے دبی ہوئی تمام باتیں اُس سے کہیں۔ اُس سال موسم کتنا خراب رہا تھا۔ بارش تھم نہیں رہی تھی۔ اُگتی فصل کو پھپھوندی کھا گئی تھی اور پروان چڑھنے پر ٹڈی دل۔ ٹڈیوں نے تو نیم کے پتّے تک نہیں چھوڑے تھے۔ تمام ہریالی رنڈ منڈ ہو گئی تھی۔ اوپر سے جیوتشی چین نہیں لینے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ آٹھ سیارے اکٹھے ہونے والے ہیں۔ لیکن وہ ملنے میں نہیں آرہے تھے۔ یہ بات الگ تھی کہ روزمرہ کا کاروبارِ حیات جاری تھا۔ جاٹ اُسی جوش و خروش سے اپنی فصلوں کو ٹڈی دل سے بچا رہے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں بدستور کنوؤں، ٹیلوں اور کھنڈروں میں ملتے اور پھر آنکھیں لڑا کر پانی کی بالٹی پکڑ کر یا بھٹی سے دانے بھنا کر چباتے ہوئے واپس آتے تھے۔

بے بے کے کان میں کوئی بات پڑتی اور کوئی نہ پڑتی۔ ہاں ایک افواہ جو پنجاب بھر میں پھیل گئی تھی بے بے تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ بھاکڑہ کی جھیل میں اتنا پانی جمع ہو گیا تھا کہ بھاکڑہ ڈیم اُسے دیر تک روک نہیں سکتا تھا۔ ڈیم ٹوٹنے سے کیا نقصان ہو گا اُسے بچہ بچہ جانتا تھا۔ پنجاب کا عالیشان عجوبہ دوبارہ سمندر میں جا گرے گا۔ ببول اور بیریاں تو کیا ببول اور بیریوں کی جڑیں تک اکھڑ جائیں گی۔ رتیلی اور بنجر زمین کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ پانی اور ہوا دریاؤں کا رُخ بدل دیں گے۔ دندناتے ہوئے سیلاب خندقوں اور گڑھوں کو سمجھتے ہی کیا ہیں۔ ؟ ندی نالے جرنیلی سڑک کی طرح سیدھے بہہ نکلیں گے۔

دل ہی دل میں ہر آدمی ڈر رہا تھا۔ لیکن اوپر اوپر سے سب ہنس رہے تھے۔ اگر اُس سیلاب سے کوئی ڈرتا نہیں تھا تو وہ بچے تھے۔ ایک راہگیر نے اخروٹ کھیلتے ہوئے لڑکوں سے پوچھا تھا کہ وہ اس گھور اندھیرے میں اتنے زور سے کیسے کھیل رہے تھے۔ اُس وقت ایک لاپروا لڑکے نے کہا "اور کیا

کریں۔؟ باپو کہتا ہے کہ چند روز میں دُنیا ختم ہو جائے گی۔" نصیب اس حالت میں بھی گھبرایا نہیں تھا۔ جموں والی بے بے خوش تھی کہ نصیب نے لوگوں کی طرح ڈرتے ہوئے اپنی بہن کے بیاہ کی تاریخ ملتوی نہیں کی تھی۔ وہ خوش تھی کہ وہ لڑکے کی منت سماجت کر کے لڑکی کے بیاہ میں جا بیٹھے گی۔ کیا ہوا جو اس کی سُنی اَن سنی کر دی جائے گی۔ اُسے کچھ کہنے کا موقع تو ملے گا۔

"بیٹا تو عین موقع پر آگیا ہے۔ مجھے لڑکی کا بیاہ ضرور دکھانا۔ میں یہاں کوٹھڑی میں پڑی رہتی ہوں۔ دو دن کے لیے مجھے شامیانے کے نیچے ضرور بٹھانا۔ کیا خبر مجھے اور کتنے دن جینا ہے۔ مرنے سے پہلے میں گاؤں کی صورت دیکھ لوں گی۔"

اتنا کہہ کر جموں والی بے بے خاموش ہو گئی۔ اس سے زیادہ وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ اپنی بیماری میں ہی کچھ پوچھ لے۔ کیا ابھی تک کسی نے ادھرنگ کا علاج نہیں ڈھونڈا تھا؟ کیا کلکتے میں بھی اس کی دوا نہیں ملتی تھی؟ کیا وہ دوا کھا کر گاؤں کی تقریبوں میں حصّہ نہیں لے سکتی تھی؟ کیا وہ پہلے کی طرح نو بہ نو ہو کر اپنے منتشر ہوتے ہوئے خاندان یا ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے اپنے گاؤں کو مٹھی میں لے کر متحد نہیں کر سکتی؟ اُس کے روگ کی دوا کہیں نہ کہیں تو ضرور ہو گی۔ ٹھیکے دار سنت رام سے کوئی ایسی چیز ضرور مل سکتی تھی جس کی بدولت وہ پہلے کی طرح صحت مند ہو کر بیٹھ سکتی تھی۔ سنت رام نے آدھے گاؤں کو خوشحال بنا دیا تھا۔ کیا وہ ایک بڑھیا کی فریاد نہیں سُن سکتا تھا۔ بے بے کا جی چاہتا تھا کہ سنت رام اور نصیب خدا کو بازو سے پکڑ کر اس کے قریب لے آئیں تو وہ بے بے کے قدموں میں گرا اپنی دی ہوئی بیماری واپس لے لے۔ اس کی نظروں میں سنت رام وہ سپیرا تھا جو اپنے منکے سے سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے کے لیے اسی سانپ کو کیل کر لے آتا تھا جس نے ڈسا ہوتا تھا۔ اور سانپ کو سپیرے کا حکم مانتے ہوئے اپنا زہر چوسنا پڑتا تھا۔

پہلے بیاہ میں بیٹھنے اور اب صحت یاب ہونے والی بات سے جموں والی بے بے کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ نصیب کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ آدھے دھڑ ہی سے چلنے پھرنے لگے گی۔ نصیب نے بے بے کو یہ تسلی دی کہ آج دنیا میں کوئی بیماری لاعلاج نہیں۔ ڈاکٹروں کے پاس ہر ایک مرض کی دوا ہے۔ اس لیے بے بے کو اس قدر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن یہ بات سُن کر بے بے کے چہرے کی رونق کچھ مدھم پڑ گئی۔ وہ شاید پوری طرح صحت یاب بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اُس کے خیال میں چھ مہینے کے اندر دنیا اتنی بدل چکی تھی کہ بے بے دوبارہ اُسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی تھی۔ اس کے بیٹے اور بہوئیں اور اس کے خویش و اقارب کچھ کے کچھ

ہو گئے تھے۔ وہ ان کو کیسے مجبور کر سکتی تھی کہ وہ سب پہلے کی طرح اس کا احترام کریں؟ گاؤں کا عرضی نویس بتایا کرتا تھا کہ وہ چار دن کے لیے کام پر نہیں جاتا تھا اور ان چار دنوں میں ساری تحصیل کی دنیا بدل چکی ہوتی تھی۔ اس کے پکّے گاہک بھی نئے عرضی نویس سے کام لینا شروع کر دیتے تھے۔ شاید اب اُس کی دُنیا پر کسی اور نے تسلّط جما لیا تھا۔ بے بے کو اُس دنیا سے خوف آتا جس کی صحت یاب ہو کر بھی وہ مالک نہیں بن سکتی تھی۔ اب اسے کون پہچانتا تھا۔ وہ اُداس ہو گئی۔ اُسے کسی کی برات سے کیا لینا تھا۔ کسی کی خوشی میں اس کی تسکین کہاں تھی۔ جب وہ خود بچھڑنے والوں سے زیادہ بھولی بسری ہو گئی تھی۔

نصیب چپ چاپ جمّوں والی بے بے کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے ماتھے پر اس کی سوچیں چھپے ہوئے الفاظ کی طرح نمایاں تھیں۔ اس کی آنکھیں دور خلا میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی باطنی آنکھ سے لوگوں کو اشٹ گرہی (آٹھ ستاروں کا اجتماع) سے ڈر کے مارے بھاگتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اَن گنت لوگوں نے اپنے گھروں سے نکل کر اونچے اونچے ٹیلوں پر ڈیرے ڈال دئے تھے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا سارا خاندان اُسے بھوسے کی کوٹھڑی میں چھوڑ کر ماتا رانی (دیوی ماتا) کے ٹیلے پر جا بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے خاندان کے ایک بھی فرد کو اُس سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔

پرماتما کی مہربانی کی کوئی انتہا نہیں تھی جس نے بھاکڑے کا بیکراں پانی روک رکھا تھا۔ بے بے کو جھیل کا پانی بس گھولتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پانی جیسے اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کی افواہ جھوٹی نہیں ہوا کرتی۔ اُس نے اپنی جوانی میں کوئٹہ کے زلزلے کی اَن گنت کہانیاں سنی تھیں۔ اُس وقت یہ سب کچھ سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ لیکن بھاکڑہ ڈیم کا ٹوٹنا اُسے خدا کی رضا معلوم ہوتا تھا جسے ایک ہی ریلے میں پنجاب کو ختم کر دینا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ کسی طریقہ سے اُس انجینئر سے ملے جس نے اس قدر پانی قید کر دیا تھا۔ بے بے کا یہ یقین تھا کہ اس انجینئر کو اس بات کا پورا علم نہیں تھا کہ اُس منحوس دن جب وہ ادھرنگ کی مریضہ ہو کر زندگی سے بیزار ہو جائے گی تو اتنا بڑا ڈیم بھٹے کی طرح ٹوٹ جائے گا۔

بے بے نے خلا میں سے نگاہ واپس لاتے ہوئے نصیب کی طرف دیکھا اور بولی "ہاں — سچ — تجھے تو سب کچھ معلوم ہو گا اس بھاکڑہ بند کے ٹوٹنے کا — بھلا کتنے دن رہتے ہیں؟ وہ کچھ دن نکال سکے گا یا نہیں —؟" اس نے آخری جملہ اپنے دل پر بھاری بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔ تاکہ پاس کھڑا نصیب یہ نہ بھانپ لے کہ بھاکڑہ ڈیم ٹوٹنے کی بے بے کو بہت خوشی ہے۔

یہ عین قدرتی بات تھی کہ نصیب بے بے کے دل میں پیدا بھاکڑہ ڈیم کے متعلق خیالات کو بھانپ

نہیں سکا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ بات مستقبل بعید میں بھی ممکن نہیں تھی "بے بے — تمہیں یہ کیا ہو گیا۔ یوں ہی ڈر رہی ہو۔ کوئی بندھ نہیں ٹوٹے گا — کیا وہ کسی اناڑی کا بنایا ہوا ہے عظیم کاریگروں کے ہاتھ اُس میں لگے ہیں۔ لوگ تو کنجر ہیں جو ایسی افواہیں پھیلا دیتے ہیں۔ تم مزے سے بے فکری کے ساتھ لیٹی رہا کرو۔" اُس نے بے بے کی ڈھارس بندھائی۔

نصیب نے دیکھا کہ یہ سُن کر بے بے کا چہرہ روئی کی طرح سفید ہو گیا۔ اس کے آدھے دھڑ کی نبض تیز تیز چلنے لگی "ہیں" وہ دھڑکتے ہوئے دل سے بولی جیسے اُس کے ساتھ بہت بڑی ٹھگی کی گئی ہو۔ وہ چارپائی پر اس طرح مایوس ہو کر گر پڑی جیسے اس کے زندہ دھڑ میں بھی جان نہ رہی ہو۔

دلیپ کور ٹوانہ

مرنے کا موسم

رچنا نے آدھی رات کے قریب یہ خواب دیکھا کہ اس کے پاؤں کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔
وہ چونک کر بیدار ہوگئی۔
اُٹھ کر بیٹھ گئی۔
اُس نے بتی روشن کی۔ پاؤں کو ٹٹول کر دیکھا۔ بستر جھاڑا۔ لیکن وہ تو محض ایک خواب تھا۔

شاید اسے کل کی بات یاد آرہی تھی۔ سینما جاتے ہوئے وہ ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگانے لگی تھی۔ جب اس کی ماں نے کہا تھا "اندھیرے سویرے پھولوں میں ہاتھ نہ مارا کر۔ ساون کا موسم ہے۔ سو طرح کے سانپ اور کیڑے ہوتے ہیں۔"

ساون کے مہینے بادل برستے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پھل اور ترکاریاں پھلتی پھولتی ہیں۔ جھولے پڑتے ہیں۔ مال پُوئے پکتے ہیں۔ تیجوں کے بہانے سے بھائی سُسرال سے بہنوں کو لاتے ہیں...اور...
...اور...اس مہینے سانپ بہت ہوتے ہیں۔ رچنا سوچ رہی تھی۔

دُور کہیں کتے بھونک رہے تھے۔
پھڑ پھڑاتا ہوا کوئی کالا پرندہ رات کے اندھیرے میں ان کے گھر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔
"میں نے یہ خواب کیوں دیکھا...؟ سانپ کاٹ کھائے تو لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ لیکن میں تو مرنا نہیں چاہتی۔ ابھی میرے مرنے کا موسم نہیں آیا۔"
"کیا مرنے کا بھی کوئی موسم ہوتا ہے؟" رچنا نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔
نلکے میں سے پانی قطرہ قطرہ گر رہا تھا۔

اُسے پھر خواب کا خیال آیا۔

"ہاں — موسم صرف بیرونی نہیں ہوتے۔ دل کے موسم بھی ہوتے ہیں۔ ان میں ایک موسم ایسا بھی ہوتا ہے جس میں کھڑے ہو کر آر پار کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ رُت بانجھ ہوتی ہے۔ اس موسم میں بگولے اُٹھتے ہیں جن میں بھوت ناچتے ہیں۔ وہی تو مرنے کا موسم ہوتا ہے۔" رچنا نے اندھیرے کا دباؤ اپنی سانسوں پر محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

"لیکن میں تو ابھی مرنا نہیں چاہتی — اِس پار اروند میرے ساتھ ہے — اُس پار ہمارا مستقبل۔ راستے میں پھول اُگے ہوئے ہیں۔ اروند نے ایک پھول میرے بالوں میں لٹکا دیا تھا۔"

رچنا کو پھر خواب والے سانپ کی یاد آئی۔

"بھری دُنیا میں کیا اُسے مجھے ہی کاٹنا تھا۔ لیکن اس کا بھی کیا قصور — یہ اُس کا وطیرہ ہے — سبھاؤ ہے — اروند کا سبھاؤ کتنا اچھا ہے۔ جیسے ٹھنڈے پانی کا بہتا دریا۔"

دریا میں باڑھ بھی آجاتی ہے۔ لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں۔ نہیں میں ڈوب کر مرنا نہیں چاہتی۔

اندھیرے میں بیٹھی کالی بلّی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میں آج کیسی فضول باتیں سوچ رہی ہوں۔" اُس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی۔ لیکن ... اروند آج اس وقت اُسے نہ جانے کیوں اتنا یاد آرہا تھا۔ اروند اُس کا منگیتر جو دس میل کے فاصلے پر ایک دوسرے شہر میں اس وقت سو یا پڑا ہوگا۔

شاید وہ میرے خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ سوچ کر وہ کھل اُٹھی۔

چاند آسمان پر چلتا چلتا عین اس کے مکان کے اوپر آپہنچا تھا۔

"لیکن یہ تیز تیز کہاں جا رہا ہے؟ اروند کے شہر کو —؟" یہ سوچتی ہوئی رچنا پھر مسکرا دی۔

اروند اس بات پر اسے چھیڑا کرتا تھا کہ وہ سامنے آیا نہیں اور وہ مسکرائی۔ وہ بہت مضبوط مُنہ بناتی لیکن اُسے ہنسی آ ہی جاتی۔

نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ رات کی رانی کی مہک آئی — وہ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی خوشبو کو اپنے اندر جمع کرنے لگی۔

"لیکن کہتے ہیں کہ رات کی رانی کی خوشبو کے نیچے سانپ آجاتا ہے — ہاں سانپ —"

اُس نے اُٹھ کر بجلی جلادی ـــــ اُس نے پانی کا ایک گلاس پیا اور پھر پاٹھ کرنے بیٹھ گئی۔
پاٹھ میں اُس کا جی نہیں لگ رہا تھا ـــ نہ جانے اُسے کیوں بے کلی سی محسوس ہو رہی تھی۔
ریلوے اسٹیشن پر گاڑی نے سیٹی دی۔
یہ سیٹی اسے بہت بیگانی سی اور ڈراونی سی لگی۔
"بی بی ـــ چائے رکھ دوں؟" اُس نے اپنی ماں سے پوچھا جو جاگ اٹھی تھی۔
"تو آج اتنی سویرے کیسے جاگ پڑی؟"
"ویسے ہی نیند کھل گئی"
"تو پڑھ لے۔ چائے میں رکھے دیتی ہوں" یہ کہہ کر اُس کی ماں اُٹھ بیٹھی۔
رچنا غسلخانے میں نہانے کے لیے چلی گئی۔ نہا کر تیار ہو گئی۔
اُس نے چائے پی لی ـــ تھوڑا سا اخبار بھی پڑھ لیا۔ دادی کو رامائن کا ایک ادھیائے بھی سُنا دیا۔ لیکن کالج کا وقت ابھی تک نہیں ہوا تھا۔
آج دن آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔
وہ کالج کی طرف چل پڑی۔ اڈے کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے اروند کا خیال آیا۔
اروند کے شہر جانے والی بس نے ہارن دیا۔ جیسے وہ اُس کو بُلا رہی تھی۔
رچنا تیزی سے بس پر سوار ہو گئی۔
اروند سے کیا کہے گی کہ وہ کیوں آئی ہے؟ یہ سوچ کر اُسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا۔
"کہہ دوں گی کہ ایک بُرا سپنا آیا تھا ـــ وہ مذاق کرے گا ـــ ابھی تو وہ جاگا بھی نہیں ہو گا۔
اُس کا دفتر دس بجے لگتا ہے"۔ وہ ان ہی خیالات میں کھوئی رہی کہ اروند کا شہر آ گیا۔
اڈے سے تھوڑے فاصلہ پر اروند رہتا تھا۔
بجلی کے تار سے چھو کر ایک چڑیا مر گئی اور اُسی تار سے لٹک گئی۔
اروند کا گھر آ گیا۔
رچنا نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔
"کون؟" اروند نے اندر سے پوچھا۔
رچنا نے مُنہ سے کچھ کہنے کے بجائے پھر دروازے پر دستک دی۔
چند منٹ کے لیے خاموشی طاری رہی۔

اس نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا اور اس دفعہ کافی زور سے۔

اروند نے دروازہ کھولا۔

رچنا مسکرائی۔

اروند جیسے گھبرا گیا۔

رچنا اُسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔

"رچنا — یہ سوشما ہے — ہمارے دفتر کی اسٹینو — رات — رات — دیر ہو گئی تھی — مَیں نے کہا — میں نے کہا — دفتر کا ضروری کام کرنا تھا —" اروند گھبراہٹ میں نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔

رچنا نے ایک بار سوشما کی طرف گردن اوپر اُٹھا کر دیکھا اور کہا "میں رچنا ہوں — اروند کی منگیتر۔"

اور پھر اُس نے اروند کو غور سے دیکھا۔

اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

"معاف کیجئے گا — مجھے اطلاع دئے بغیر نہیں آنا چاہیے تھا" یہ کہہ کر وہ اُلٹے پاؤں لوٹ گئی۔

اروند اُسے آوازیں دیتا رہا۔ لیکن اُسے یوں محسوس ہوا "میں رچنا نہیں — یہ اروند نہیں — میں کہاں آ گئی ہوں — یہ لوگ کون ہیں؟ یہ کون سا موسم ہے —؟ آر پار کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

اس کے دل سے کتنے ہی بگولے اُٹھ رہے تھے، جن میں بھوت ناچتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اپنے شہر جانے والی بس میں بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جس پر رات کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اور اُس کا زہر اُسے اب چڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

بُوٹا سنگھ

مائی سدھراں

دسمبر کی ٹھنڈی رات نے مائی سدھراں کے بدن میں کپکپی پیدا کر دی تھی۔ اس کے مُنہ میں دو تین دانت جو باقی رہ گئے تھے بجنے لگے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سُن ہوئے جا رہے تھے۔ اس قہر کی سردی کے باعث اس کی ناک اور اُس کے مُنہ سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ منٹ منٹ بعد راستہ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں پونچھتی۔ لیکن آنکھوں میں سے گرتا ہوا پانی اُس سے روکا نہ جاتا۔ جوں جوں اُسے زیادہ سردی لگتی وہ اپنی جوتی گھسیٹتی ہوئی تیزی سے چلنے لگتی۔ بوری کا ایک ٹکڑا اپنے گرد لپیٹے، ہاتھ میں لوہے کی ایک کترن تھامے اور ایک چھوٹی سی خالی بوری اُٹھائے چاروں طرف دیکھتی وہ یارڈ میں آ گئی۔

یارڈ میں قبرستان جیسی خاموشی مسلط تھی۔ کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سائیں سائیں کرتا یارڈ آج اُسے کچھ زیادہ ہولناک اور سنسان نظر آ رہا تھا۔ وہ کھڑی گاڑیوں کے سایہ میں چلتی ہوئی سوچ رہی تھی "دن نکلنے ہی والا ہے۔ لیکن یارڈ میں ایک بھی آدمی دکھائی نہیں دے رہا ہے اور نہ شنٹ کرتے ہوئے کسی انجن کی آواز آ رہی ہے۔ سردی نے آج سب کو اندر دبکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کوئی بھی ڈرتا ہوا باہر مُنہ نہیں نکالتا۔

"ڈیوٹی دینے والے بھی ایسی سرد رات میں ناغہ کرتے ہیں۔ یہ سرکار کے رکھوالے واچ مین گدیوں والے ڈبوں میں خراٹے لے رہے ہوتے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسی سخت رات کو اپنا ہاتھ بھی باہر نکالے۔ ایسی سردی میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ سب کو اپنا سر چھپانے کی پڑی ہوتی ہے۔ ایک میں ہی بدنصیب ہوں جسے دن رات چین نہیں ــــ پچھلے جنم کے کھوٹے کرم آگے آ رہے ہیں۔ تمام عمر ایک دن بھی آرام کا سانس نہیں لیا۔ بکھیڑوں سے نپٹتے یہ دن آ گئے ہیں۔ ایک ایک کوئلہ کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اپنی جوانی برباد کر لی ہے۔"

مائی سدھراں یہ باتیں سوچتی ریل کی پٹڑیاں پھلانگتی جا رہی تھی۔ بجلی کی تیز روشنی میں ریل کی لائین اُسے سانپ کی طرح بل کھاتی اور مُنہ پھاڑے دکھائی دے رہی تھی اور منہ پھاڑے یہ ناگنیں کئی بار اُسے کودنے نہ دیتیں۔

اور وہ بمشکل گرتے گرتے بچتی۔

سدھراں کو یارڈ میں کوئلہ چنتے ہوئے کئی برس بیت چکے تھے۔ وہ دلی اسٹیشن کے تقریباً ایک میل لمبے یارڈ کے چپے چپے سے واقف تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ لائینوں کا کراسنگ کہاں تھا۔ کہاں بڑا کانٹا ہے۔ کہاں چھوٹا کانٹا ہے۔ کہاں حوض ہے۔ اور کہاں گندے پانی کا گڑھا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کوئلہ چنتے ہوئے کوئی واچ مین پیچھے بھاگے تو اُسے کوئلہ کہاں چھپانا ہے اور خود دوڑ کر کہاں چھپنا ہے — پکڑے جانے پر واچ مین سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ حوالدار مل جائے تو اُس سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔ کلینر کو کیسے دُھتکارنا ہے۔ فٹر سے کیسے ہنس ہنس کر باتیں کرنی چاہئیں — سدھراں نے کئی بار اپنی جان پر کھیل کر کوئلہ بچایا تھا۔ وہ کوئلہ اُٹھائے دوڑتی دوڑتی شنٹ کرتے ہوئے انجن کے آگے سے گزر جاتی اور پکڑنے والوں کے ہاتھ نہ آتی۔ سدھراں اکثر سوچا کرتی — "یہ پیسے لینے والے کتنے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ اکنی دونی تھما دو اور کوئلوں سے ٹوکرا بھر لو — انجن کے فائرمین کو دونی دکھا دو — وہ کوئلوں میں سلاخ مارے بغیر کہیں نہ کہیں دہکتے ہوئے کوئلوں کا انبار لگا دے گا۔ یہ پیسے لینے والے لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ نہ خود کو کوئی تکلیف ہوتی ہے نہ دوسرے کو — یہ جو حد سے زیادہ ایماندار ہوتے ہیں بہت ہی بُرے ہوتے ہیں۔ ان کا تو پیٹ کسی بات سے بھرتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کہتے ہیں کہ گرہ میں جو کچھ ہے نکال کر رکھ دو۔ اور اگر کچھ نہیں ہے تو خالی ڈبے میں چل کر ہماری بات سن لو۔ کتے — کمینے — نہ ماں کی شرم نہ بیٹی کی — ان بدمعاشوں کو تو گوشت چاہیے — چاہے وہ بوڑھے کا ہو یا جوان کا — کھانے والے کو کیا — اُسے تو اپنی غرض پوری کرنی ہوتی ہے ..... محسوس تو اُسے ہوتا ہے جس کی ہڈیاں چچوڑی جاتی ہیں۔ لیکن اب تو کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ سب ڈانٹتے تھے — دھکے دیتے تھے —— یہ سوچتے ہوئے مائی سدھراں نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں میں سے بہتا پانی پونچھا تو اُسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے چہرے کی جھُرّیاں سردی سے اکڑ گئی تھیں۔ وہ پھر سوچنے لگی — "ایک وقت تھا کہ وہ اپنی جوانی چھپاتے ہوئے خدا سے بڑھاپا مانگتی تھی" جل جائے یہ جوانی جو مجھے کہیں کھڑی بھی نہیں ہونے دیتی — لیکن بڑھاپا تو اس سے بھی بُرا ہے۔ اب سب مجھے دُھتکارتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑھاپا لعنت ہوتا ہے — پیسہ اور جوانی دونوں بے حیا ہوتے ہیں۔ اب نہ پلّے پیسہ ہے نہ جوانی — کس برتے پر تتا پانی۔ پیسہ سارا بدن کی بیماری پر صرف ہو گیا۔ جن مصیبتوں سے نجات ملی تھی وہ پھر گلے پڑ گئیں۔ خاوند کے مرنے کے بعد مزدوری کر کے بدن کو بڑا کیا تھا اور اپنا تن بیچ بیچ کر اس کی نوکری لگوائی تھی۔ اس کا بیاہ کیا تھا ..... خدا نے بچہ بھی دیا — خیال تھا کہ اب مصیبت ختم

ہو جائے گی۔ لیکن پچھلے جنم کے کھوٹے کرم مجھ جیسی بدنصیب کو آرام کا سانس کہاں لینے دیتے ہیں۔ بیاہ ملک الموت بن گیا۔ لڑکا سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گیا۔ اور پھر سدھراں کو اپنے بیاہ کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگی "شادی شادی ہی ہوتی ہے۔ جب وہ پہلے دن بدن کے باپ کے ساتھ آئی تھی تو اس کے دل میں کتنے چاؤ تھے اور وہ دن رات سدھراں سدھراں کہہ کر بلایا کرتا۔ اور جب اُسے رات کے پچھلے پہر نوکری پر جانا ہوتا تو وہ مجھ اکیلی کو چھوڑ کر نوکری پر نہ جاتا۔ بیماری کا بہانہ کر دیتا اور کئی کئی دن گھر سے باہر نہ نکلتا۔ وہ کہا کرتا۔ سدھراں تو فکر نہ کیا کر۔ تو میرے پاس ہی بیٹھی رہا کر۔ کھانے پینے کا انتظام میں بازار سے کر لوں گا۔ تنخواہ ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔ پیچھے ہمارے کون سے ماں باپ بیٹھے ہیں۔ جن کو کچھ بھیجنا پڑے گا۔

"جی ہاں۔ جبھی تو پڑوسنیں مجھے ہر روز چھیڑتی ہیں اور ہنستی ہیں۔ ساس نہ نند۔ گھر میں بہو کا راج۔ اور دن بھر اسے اپنے گھٹنے سے لگائے رہتا ہے۔ ذرا کوارٹر سے باہر نکل کر دیکھو کہ دنیا کہاں بستی ہے۔"

"سدھراں تو مست رہا کر۔ لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کیا کرتے۔ لوگ کسی کو کھاتا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔" یہ باتیں سوچتے ہوئے سدھراں کے سینے سے آہ نکل گئی اور ہوا کے تیز جھونکے نے اُس کے خیالوں کا سلسلہ منتشر کر دیا۔

بجلی کی روشنی پر اس کی نظریں جمتی نہیں تھی۔ اُس کے پاؤں خود بخود لائینیں اور کانٹے پھلانگتے جا رہے تھے۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھے اور ٹوٹی جوتی گھسیٹتی ہوئی دوڑتی جا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ چوروں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ گاڑی کے سایہ میں کھڑی ہو کر جھنک لیا کرتی تھی۔ کہیں کوئی اس کا پیچھا نہ کر رہا ہو۔

اب سدھراں کو کچے کوئلے کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ بجلی کی روشنی میں وہ اونچے اونچے ڈھیر اسے سونے اور چاندی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے جن میں بڑے بڑے ڈھیلوں اور چورے سے بدن کے لیے دوا، بچے کے لیے چاول اور ساس بہو کے پیٹ کے لیے مکئی کا آٹا آئے گا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج کتنا اچھا موقع ہے چاہے سردی سے ہڈیاں کڑک رہی ہیں لیکن وہ آسانی سے دو پھیرے لگا سکتی ہے۔ اگر آج وہ کچے کوئلے کے دو پھیرے لگا لے تو سردی کے یہ دو تین دن آرام سے گزر جائیں گے۔ اور وہ دوپہر کو سنڈر بھی چن لیا کرے گی۔ راکھ کے ڈھیروں میں سے سنڈر چننے سے کون روک سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا جیسے بدن راکھ کے ڈھیر میں سے جوان ہوا ہے اور اب اُس کا بیٹا بھی اس میں سے

سر اُبھار رہا ہے۔

کچے کوئلہ کے دو ڈھیر ـــــ گھر کے تمام افراد کی دو دن کی خوراک ہیں .... آج موقع ہے ـــ اتنی سرد رات میں کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ آج تو تین پھیرے بھی لگ سکتے ہیں۔ ان ہندوؤں سے مسلمان اچھے تھے .... آگ لگ جائے اس ہندوستان ـــ پاکستان کو ـــ پریشان کر دیا ہے۔ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر اشتراک اور سانجھا پن تھا۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اب تو کتے کا کتا بیری ہے۔ اگر آج قربان علی شاہ ہوتا تو میری یہ دُرگت نہ ہوتی۔ وہ تو مجھ پر اپنی جان نچھاور کرتا تھا۔ اُس نے پیسے کی کبھی تنگی نہیں آنے دی تھی۔ نتھا سنگھ ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ لیکن نتھا سنگھ کی کیا مجال تھی جو شاہ صاحب کے سامنے ہاتھ بھی لگا جائے۔ بھابی بھابی کہتے اُس کا منہ سوکھ جاتا تھا۔ نتھا سنگھ نے کئی بار کہا تھا "بھابی میرا کہنا مان لو ـــ قربان علی شاہ سے نکاح کر لو ـــ ابھی وقت ہے۔ یہ جوانی اور یہ روپ سدا نہیں رہتے۔ تمہارا بدن بھی پل جائے گا اور تم بیگم بن جاؤ گی ـــ اب کس بات کا پرہیز رہ گیا ہے ـــ اب اپنا برہمن پن چھوڑ دو۔"

"ہائے ـــ ہائے ـــ نتھا سنگھ کچھ تو شرم کر ـــ مسلمان سے شادی کر کے اپنا دھرم بھرشٹ کر لوں۔"

"اچھا بھابی تمہاری مرضی ـــ پہلے تم کون سا گنگا نہاتی ہو۔ روز تمہیں وہ گاڑی کے اندر لے جاتا ہے ـــ اُٹھائے پھرو اس لوک لاج کو ـــ ـــ تمہیں کون نہیں جانتا۔ شاہ صاحب سے ڈرتے ہوئے لوگ بولتے نہیں۔ ورنہ تم سے کون ڈرتا ہے ہماری بات یاد رکھنا بھابی ـــ تم اس وقت کو یاد کرو گی اور افسوس سے ہاتھ مل مل کر رویا کرو گی۔"

سدھراں آہیں بھرتی، سوچتی اور آنکھیں پونچھتی لائنیں پھلانگتی جا رہی تھی۔ جب وہ واشنگ لائن پھلانگنے لگی تو اُس کا پاؤں گڑھے میں جا پڑا۔ سردی سے ٹھٹھرتی مائی سدھراں منہ کے بل گری۔ اس کے گھٹنے چٹخ گئے۔ لوہے کی کترن اُس کی ہتھیلی میں گھس گئی۔ اُس میں سے اُسے لہو ٹپکتا ہوا محسوس ہوا ـــ درد کے مارے اُس سے اُٹھا نہ گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بلند آواز میں چیختے ہوئے رو پڑے۔ وہ سوچتی تھی اس جینے سے موت اچھی ـــ اس کے بغیر دنیا کے کون سے کام بند ہیں۔ وہ یہ باتیں سوچتی ہوئی لائن کے پار پہنچی تھی کہ چھک چھک کرتا انجن اس کے قریب سے گزر گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ اچھا ہوتا اگر وہ انجن کے نیچے آ کر ختم ہو جاتی۔

سدھراں سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اور اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سامنے کوئلے کے الاؤ کے

پاس جائے اور آگ تاپ لے۔ کوئلے کے الاؤ کے قریب کھانستے بوڑھے کو وہ اس کی آواز سے پہچانتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ آگ تاپنے لگی، تو بوڑھا کھوسٹ پرانی کہانیاں چھیڑ دے گا۔۔ حرامی نواسوں پوتوں والا ہو گیا ہے، قبر کے کنارے بیٹھا ہے لیکن اب بھی ٹھرک جھاڑنے سے باز نہیں آتا۔ سدھراں درد کے مارے روتی اور اپنی ٹانگ گھسیٹتی اٹھی۔ اس نے سب سے پہلے کوئلہ اٹھانے کی بات سوچی۔ اگر دو نہیں تو ایک پھیرا تو ضرور لگ سکتا ہے۔ وہ ذرا آگے بڑھی تو اسے کچھ روشنی سی نظر آئی۔ واچ مین گاڑیوں میں سے اپنی پگڑیاں سنوارتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اُس کا دِل بیٹھ گیا اور اُس کا تمام درد جاگ اُٹھا۔

سدھراں کو خالی ہاتھ دیکھ کر اُس کی بہو جوماں اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی "یہ بوڑھی ڈائن نہ مرتی ہے نہ بیچا چھوڑتی ہے۔ بڑی آئی شرم والی۔ سارے خاندان کو بد دعا دے رکھی ہے۔ نہ باہر نکلو۔ نہ پیٹ بھر کے کھاؤ۔۔ منہ اندھیرے گھر سے نکلی تھی۔ اب روتی ہوئی خالی گھر میں آ گھسی ہے۔۔ مکار۔۔ ریاکار۔۔ کہیں گُل بکاولی کی ہڈی نہ کھسک جائے۔ کہیں دہکتی انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر گھر چلی آئی ہے۔۔ ۔۔۔ کئی دفعہ پیٹ چکی ہوں۔ تو نہ جایا کر۔ اب تجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔ گھر بیٹھ کر کھایا کر۔۔ لیکن یہ بی بی پاکدامن۔۔ شرم والی۔ مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتی۔ جیسے میں کوئی بتاشہ ہوں کہ کوئی مجھے مُنہ میں ڈال لے گا۔ آج میرا سارا کنبہ بھوکا ہے۔ گھر میں آٹے کی ایک چٹکی نہیں۔ جس دن سے اس گھر میں آئی ہوں مصیبت ہی دیکھی ہے۔۔" مائی سدھراں روئے جا رہی تھی۔ لیکن جواب نہ دے سکتی۔ اگر وہ بولنے کی کوشش کرتی تو اس کی بہو جوماں اور زیادہ گرجنے لگتی "کل صبح میں خود کوئلہ لانے جاؤں گی۔ دیکھنا بوری بھر کر لاتی ہوں کہ نہیں۔۔ نیت صاف نہیں اور بہانے سینکڑوں۔۔ بس روٹی کھانی آسان ہے۔۔"

وہ دن ساس اور بہو کا ایک دوسری سے لڑتے جھگڑتے گزر گیا۔ سدھراں رات بھر اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں سوچتی اور روتی رہی۔ اس کے دل میں کچھ اپنی چوٹ کا درد تھا اور کچھ جوماں کی باتوں کا۔ وہ ٹاٹ اپنے گرد لپیٹے لیٹی رہی اور سوچتی رہی "جوماں کس قدر چرب زبان ہو گئی ہے۔ اُسے کیا خبر کہ یارڈ میں سے کوئلہ لانا آسان نہیں ہے۔ اپنا سب کچھ لُٹا کر کوئلے کے دو ڈھیلے ملتے ہیں۔" ایسی باتیں سوچتی ہوئی مائی سدھراں کو نہ جانے کب نیند آ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ جوماں جھونپڑی میں نہیں تھی اور نہ وہاں لوہے کی کرتن اور خالی بوری پڑی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا اور وہ دروازے میں کھڑی

ہو کر باہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ دروازے میں کھڑی اسے یوں محسوس ہوا جیسے طوفان نے جھونپڑی اُکھاڑ کر پھینک دی ہو اور وہ تنکا تنکا ہو کر بہی جا رہی ہے — مائی سدھراں دیر تک دروازے سے لگ کر باہر دیکھتی رہی۔ دُور سے آتا ہوا ہر شخص اُسے جواں معلوم ہوتا۔

پَو پھٹ رہی تھی اور جواں نے کوئلے سے بھری بوری جھونپڑی کے سامنے لا کر پھینک دی۔ ساس اور بہو دونوں نے ایک دوسری کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ جواں کی چھلکتی آنکھیں اوپر نہیں اُٹھ رہی تھیں۔ مائی سدھراں پر غشی سی طاری ہو گئی جب اُس نے اپنی بہو کے بکھرے ہوئے بالوں، آنسوؤں سے بھری آنکھوں اور پھٹی ہوئی قمیص کی طرف دیکھا۔ سدھراں کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی بہو کوئلہ لے کر نہیں آئی تھی بلکہ کشتی لڑ کر آئی تھی۔

جسونت سنگھ وردی

اپنی اپنی حد

جب مَیں باہر کا گیٹ کھول کر گل بوٹوں کے قریب سے ہوتا ہوا برآمدے میں پہنچتا ہوں تو درشی کا گلابی چہرہ دلآویز تبسم کے ساتھ میرا خیر مقدم کرتا ہے۔ اس وقت وہ گھر کی صفائی میں مصروف ہوتی ہے یا سینے پرونے میں۔ جیسے کام کے بغیر اس کی زندگی بے معنی ہو۔ وہ کوئی بھی کام کر رہی ہو مجھے دیکھتے ہی اُسے سب کام بھول جاتے ہیں اور وہ جیسے صبح سے میرا ہی انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ مجھ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اُس وقت جب وہ اپنی پیار بھری انگلیوں سے میرے بدن کو چھوتی ہے، اور میرے کپڑے کھونٹی پر لٹکاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دن بھر کی ذلتوں کا تکلیف دہ زہر شِو کا روپ دھار کر پی جانا چاہتی ہے۔ اس وقت میں ایک انوکھی مستی کے عالم میں ہوتا ہوں جیسے میں فردوس میں مقیم ہوں۔ جنت میں رہنے والے کیا مجھ سے زیادہ آسودہ اور مسرور ہیں؟ — یہ ایک ایسا سورگ ہے جس میں مَیں اِندر ہوں اور درشی میری الکا ہے۔ مسکراتے پھول اور درشی — میری الکا —

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے درشی میری الکا مجھ سے یہ سورگ چھین لینا چاہتی ہے۔

شام کی چائے سوچتے سوچتے ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دن بھر کے روز نامچے میں سے کوئی دلچسپ بات سناؤں وہ اپنی بات کہنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے — اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کی تمہید کے بعد وہ کہتی ہے "وہ ہے نا آپ کے دوست سبھروال کی بیوی کیرتی"

"ہاں — کیا ہوا کیرتی کو؟"

"اُسے بھی اسکول میں سروس مِل گئی ہے"

"اچھا — بہت بُرا ہوا —" میں جیسے جھلّا سا گیا۔

"بُرا کیوں ہوا؟" وہ بھی تلخ ہو جاتی ہے — میں نے تلخی کے ماحول کو پُرسکون بنانے

کے لئے نرمی سے کہا۔ "بس اسے بُرا ہی سمجھ لو۔" اس وقت میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے کچھ بھی تو نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں یوں ہی ادھر اُدھر کی ہانکتا ہوں۔

"درشی — دیکھو نا — عورتوں کا نوکری کرنا بہت مشکل ہے۔ آج جتنی بُری حالت ملازمت پیشہ عورتوں کی ہے اور کسی کی نہیں ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تم دیکھتی تو ہو کہ بسوں میں عورتوں کا کتنا بُرا حال ہوتا ہے۔ برسات کے دنوں میں تو قہر نازل ہو جاتا ہے۔"

"کیا برسات سال بھر رہتی ہے؟"

"سال بھر تو نہیں — لیکن سال بھر کوئی نہ کوئی مصیبت بارش کی طرح آتی ہی رہتی ہے — اور..... اور۔"

میری ان بے معنی باتوں کے آگے اُسے ہتھیار ڈالنے پڑتے۔ اُس کا چہرہ اُتر جاتا جیسے اس کی آنکھوں کے کناروں سے نمکین پانی چھلک رہا ہو۔ اُس وقت یوں معلوم ہوتا جیسے اُس کی نوکری کرنے کی خواہش پھڑ پھڑا کر خودکشی کر رہی ہو۔ کیا میں اتنا ظالم ہوں؟ — نہیں .... اور میں اُس کی تشفی کے لیے کہتا ہوں "پیاری میں اگرچہ عورتوں کی ملازمت کے حق میں نہیں ہوں۔ لیکن میں لگاتار کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں ضرور نوکری مل جائے۔ میں جانتا ہوں کہ تم دن بھر گھر میں اکیلی رہتی ہو — اور بور ہو جاتی ہو۔ اور ملازمت سے تمہاری شخصیت بھی نمایاں ہو جائے گی۔ ہے نا۔"

اور میں پھر کاغذی پھول کھلانے لگتا ہوں۔ یعنی میں اس وقت پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوں اور وہ خوش ہو جاتی ہے۔

بے چاری عورت —

جس دن سے اُس نے ایمبرائڈری اور ڈیزائننگ کی تربیت حاصل کی ہے نوکری کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں رہی ہے۔ نوکری کرنے کی خواہش اُس کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہے۔

کئی بار جب ہم لان میں بیٹھے ہوتے ہیں تو گھر کے سامنے سے کوئی خوش، چہکتا شوخ اور خوبصورت جوڑا گزر جاتا ہے تو درشی کی نظریں اس مرد پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ وہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر بڑے فخر و ناز سے چل رہی ہوتی ہے۔ وہ قد میں اپنے شوہر سے چھوٹی ہونے کے باوجود اس جیسی لمبی دکھائی دیتی ہے — میرے بولنے سے پہلے درشی کہے گی "یہ عورت ضرور نوکری کرتی

ہو گی ــــ"

"تم نے یہ کیسے پہچانا ؟"

"جب تک عورت ملازمت نہیں کرتی تب تک اس میں خود اعتمادی کا جذبہ اُبھر ہی نہیں سکتا۔"

اور وہ پھر دور جاتے ہوئے اُس جوڑے کو دیکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اور میں تصوّر میں یہ محسوس کرتا ہوں جیسے دور جانے والے میاں بیوی میں اور درشی ہوں۔ اور پھر میں یہ قیاس لگاتا ہوں کہ اگر درشی کو ملازمت مِل جائے تو اس میں کتنی خود اعتمادی پیدا ہو جائیگی۔ اس کی چال میں مضبوطی آجائے گی۔ شاید اس کی شخصیت میری زندگی پر حاوی ہو جائے اور میں دب کر رہ جاؤں۔ اس نقطہ پر پہنچکر میں سوچتے ہوئے بھٹک جاتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں درشی کے ساتھ چلتے ہوئے ایک بونا لگ رہا ہوں۔ میں سوکھے پتّے کی طرح کانپ اُٹھا جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ کیا یہ خواب حقیقت بن جائے گا ؟

اس وقت بھی درشی دور جاتے ہوئے اُس خوب صورت جوڑے کی پرچھائیں کو دیکھے جارہی ہے۔ جھکی ہوئی گردن ــــ سُستی ہوئی آنکھیں ــــ اور چہرے پر کانپتی ہوئی لو جیسی خود اعتمادی ــــ مایوسی اور محرومی کا مجسمہ درشی ــــ بے بس اور محروم ....

مجھے وہ اس موڈ میں اچھی لگی۔ یہ منظر میرے لیے کس قدر سکون بخش تھا۔ اور میں خوش ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں مسکرا پڑا اور ہلکی سی ہنسی میرے ہونٹوں پہ لرز کر رہ گئی ــــ میری یہ کیفیت دیکھ کر درشی کا انہماک ٹوٹ گیا اور وہ سٹپٹا کر بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے خوش ہو کر جھوٹ موٹ کہہ دیا۔

"میں سوچتا ہوں کہ اگر تمہیں نوکری مِل جائے تو ہماری زندگی بھی اس خوب صورت جوڑے جیسی ہو جائے اور تم بھی ــــ تم بھی"

اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ جیسے جھوٹ بولنا میرے لیے زیادہ آسان ہو گیا ہو..... زہرِ قاتل ــــ! لیکن فرطِ مسرت سے درشی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ انتہائی خوش ہو کر میرے لیے کافی بنانے کے لیے رسوئی میں چلی گئی۔

کئی دفعہ اخبار پڑھتے ہوئے میری نظر ایک معمولی اور گھٹیا سی خبر پر جم کر رہ جاتی ــــ اور میں کتنی ہی دیر تک اسے پڑھتا رہتا۔ اور یہ خبر اُس عورت کے بارے میں ہوتی جو اپنے دفتر کے کسی اسسٹنٹ کے

عشق میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ کسی اور شہر میں چلی گئی ہو..... جب میں یہ خبر چٹخارے لے کر درشی کو سناتا ہوں تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ ہاتھ کانپ کانپ اُٹھتے ہیں اور وہ تیزی سے اخبار کی تصویروں پر نظر دوڑاتی ہے۔ جوں جوں اس کے چہرے کا رنگ اُڑتا جاتا ہے میں جیسے مدہوش سا ہوا جاتا ہوں۔ اور درشی جیسے بے کلی اور اضطراب کی سولی پر لٹکی ہوئی ہو۔ اُسے اور بھی پریشان کرنے کے لیے میں بڑی تیکھی طنز سے کہتا ہوں۔

"مانا سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔ آج اسپوتنک بھی چاند پر پہنچنے کے لیے تیار ہیں۔ عورتوں کو مساوی حقوق بھی مِل چکے ہیں لیکن اس کا فائدہ؟ جب تک عورتوں میں کردار کی پاکیزگی اور مضبوطی نہیں آتی ساری انسانی ترقی بیکار ہے۔"

اس بات پر درشی بیٹھے ہوئے دل کے ساتھ پلنگ پر جا لیٹتی ہے اور کئی دن تک اس کے چہرے پر پت جھڑ چھائی رہتی ہے۔ باغیچے کے پھول بے معنی معلوم ہوتے ہیں اور برسات کی ہلکی ہلکی بوندوں سے بھی ہمارے دل میں رومان پیدا نہیں ہوتا۔

پچھلے دنوں میں درشی کی زندگی کو محکوم و مجبور رکھنے کے لیے بہت ہی بُری حرکت کر بیٹھتا ہوں۔ اور میرا ضمیر ایک گھائل پرندے کی طرح سہما ہوا پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔

اور ایک دن اچانک درشی اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر سنجیدہ سکون ہے۔ جیسے سمندر میں کوئی طوفان اٹھنے والا ہو — وہ اُس دن والی خبر کا آخری حصّہ پڑھنے کے لئے مجھ سے کہتی ہے — میں پڑھ کر یہ جان لیتا ہوں کہ اُس دن کسی اسسٹنٹ کے ساتھ بھاگ جانے والی عورت اصل میں کوئی گھریلو عورت نہیں تھی۔ وہ تو کوئی آبرو باختہ عورت تھی جو اپنی داغدار زندگی کو بے داغ بنانا چاہتی تھی۔ میں سانس لینے کے لیے تڑپا اور درشی سے نظریں چُرا کر تیزی سے پھولوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہوں "درشی وہ پھول مجھے باغیچے میں اچھے لگے ہیں ... ان کی خوشبو کو یہیں رہنے دو — درشی۔ پیاری — درشی — دیکھو نا..."

اس سے آگے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا — کچھ بھی نہیں۔

درشی ابھی تک میرے سامنے کھڑی ہے۔ اور میری دلیلوں کے تمام ہتھیار کُند کر دینا چاہتی ہے — اور میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ یہ عورت مطمئن ہے کہ وہ ایک دن میرا مقابلہ کرے گی اور خود کو مجھ سے بلند و برتر سمجھے گی۔

میں پھر اُس سے نظریں بچا رہا ہوں لیکن وہ ہر دفعہ میری نظر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

"کل میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج گئی تھی"
"تم" ۔ میں کپکپا اُٹھا۔
"ہاں" اور اس کی آواز بلند ہوتی ہوئی اور بلند ہو گئی "ڈیلنگ کلرک نے مجھے بتایا کہ بہن جی تمہیں پچھلے ہفتے انٹرویو کارڈ بھیجا گیا تھا۔ صرف ایک ہی اُمیدوار تھا..... کیا کوئی انٹرویو کارڈ آیا تھا؟"
"ہاں ــــ آیا تھا ــــ لیکن میں نے پھاڑ دیا تھا ــــ اصل میں ــــ میں ــــ میں ــــ"
اور مَیں نے اُسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا کہ میں اس سے نوکری کیوں نہیں کروانا چاہتا۔
"دو سو کی نوکری سے میں اس گھر کو اور بھی خوب صورت بنا سکتی ہوں"۔
"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے ــ نوکری کا خیال چھوڑو ــ نوکری زندگی میں کوئی بہت بڑی چیز نہیں ہے"۔
میں بہت خوش تھا کہ میں اپنی سازش کے پروگرام میں کامیاب ہو گیا تھا ــ لیکن وہ میری بات اَن سنی کرتے ہوئے زیادہ استحکام کے ساتھ کہتی چلی گئی۔
"کارڈ پھاڑتے ہوئے شاید تم نے انٹرویو کی تاریخ نہیں دیکھی تھی۔ مجھے ایک اور انٹرویو کارڈ مل گیا تھا ــ آج میں انٹرویو کے بعد اپائنٹمینٹ لیٹر لے آئی ہوں"۔

موہن بھنڈاری

مجھے ٹیگور بنا دو ماں...!

چمنیوں میں سے دھواں کسی غریب کی آہ کی طرح اُٹھ رہا تھا۔
بھٹّے کے گوشے میں کھڑے یکّہ و تنہا درخت کے نیچے پڑا وہ دھوئیں کی طرف پیہم دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

پھر اُس نے اپنی گرد سے اٹی ہوئی ٹانگیں دیکھیں اپنے سارے بدن پر نظر دوڑائی — وہ حیرت زدہ ہو کر سوچ رہا تھا کہ چھوٹی عمر میں اُس کا جسم کتنا بھرا بھرا ہوتا تھا۔ درمیانہ درجے کا — پیارا پیارا —
لیکن اب تو وہ دھوئیں سے کجلائی ہڈیوں کا ایک پنجر ہو کر رہ گیا تھا۔
اُسے ایک لمحہ کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی ایک چمنی تھا۔ کسی بند ہو جانے والے بھٹّے کی بیکار چمنی — جس کا سارا دھواں نکل چکا ہو۔
اُسے اپنے آپ پر تھوڑا سا غصّہ آیا اور اُسے اپنی حالت پر اس سے بھی زیادہ جھلاہٹ ہوئی۔
اور سب سے زیادہ غصّہ اُسے بھٹّے کے منشی پر آیا جو "ابھی آتا ہوں" کہہ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔
اور درخت کے نیچے پڑا وہ ایک گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر وہ جاتے جاتے ایک پرچی کاٹ جاتا تو اب تک وہ نصف سے زیادہ راستہ طے کر چکا ہوتا۔
اُس نے سوچا —
"سالا آگ ہے آگ"
وہ پھر دل ہی دل میں کُڑھنے لگا۔
اور پھر اُس نے اپنے گدھوں پر نظر ڈالی۔
وہ اینٹوں سے بھری جھولیوں کے بوجھ تلے خم کھائے ہوئے بھی مزے سے گھاس چرتے پھر رہے تھے۔ جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو — وہ گھاس چرنے میں اتنے منہمک تھے کہ ان کو بوجھ جیسے محسوس

ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بوجھ تو جیسے اُٹھانا ہی پڑتا ہے۔ کیا کم کیا زیادہ۔ ان کو کیا۔؟ منشی شاید دو گھنٹے تک اور نہ آئے۔

"گدھے کے گدھے ہی رہے سالو!"

وہ ان کو اس طرح بے فکری اور لاپروائی سے گھاس چرتے ہوئے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ آدمی اور گدھے میں اتنا ہی تو فرق ہے۔ آدمی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ لیکن گدھا؟ گدھا تو بس گدھا ہی رہتا ہے۔

آدمی اپنے تحت کام کرنے والوں کو گدھے ہی سمجھتا ہے۔ کیا ہوا اگر وہ آواز بلند کرتے ہیں۔! اور پھر اُس آواز کا کیا فائدہ جو سُن کر اَن سُنی کر دی جاتی ہے۔ ان سے تو گدھے ہی اچھے ہیں جو سر جھکا کر دن رات کام کرتے رہتے ہیں۔ اور محنت کے پھل کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔

اس کے گدھے ابھی تک اطمینان سے گھاس چرتے پھر رہے تھے۔

وہ ان کو دیکھ کر پھر ہنسا۔

اس دفعہ اس کی ہنسی میں وہ وسعت نہیں تھی جو عام طور سے ہنسی میں ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کے کلیجے میں ایک ٹیس سی اُٹھی تھی۔ اس کے اندر ایک کمتری سی بیدار ہوئی وہاں درخت کے نیچے پڑا وہ سکڑ کر ایک گٹھڑی سی بن گیا۔ اور چھوٹا ہو گیا۔ گدھوں سے بھی حقیر...

"سالا ابھی تک نہیں آیا۔ گدھا۔"

وہ پھر بے قرار ہو گیا۔

آدمی جو ہوا۔

اُس نے صبح صبح تین پھیرے لگا لیے تھے۔ اب اس چوتھے پھیرے کے بعد اُسے کام ختم کر دینا تھا۔ اور پھر اپنے لیڈر کی باتیں سننی تھیں جو اُن کے گاؤں میں ایک اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے آ رہا تھا۔

لیکن منشی "ابھی آتا ہوں" کہہ کر نہ جانے کہاں کھسک گیا تھا۔

گدھے ابھی تک بے فکری سے گھاس چر رہے تھے۔

آسمان پر چھوٹے چھوٹے بادل اُمڈنے شروع ہو گئے تھے۔ ہوا کے دو ٹھنڈے جھونکوں نے اُس کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ ایک لمحہ کے لیے جیسے منظر دلفریب ہو گیا۔ وہ جھوم اُٹھا۔ اور جھومتے ہوئے اس کے مُنہ سے ایک بولی (شعر) نکلی۔

"پلاّ مار کے بُجھا گئی دیوا
اکھ نال گل کر گئی !"

(دوپٹے کے پلو سے دیا بجھا گئی
اور آنکھ سے بات کر گئی)

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اسے وہ داڑھی والا بزرگ شاعر یاد آیا جو لوک گیت جمع کرتا ہوا اُس کے شاعر استاد کے پاس آنکلا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اُس کھلے بالوں والے شاعر نے بتایا کہ جب ٹیگور کو اُس نے یہ بولی سنائی تھی تو ٹیگور جھوم اُٹھا تھا۔

اُس بزرگ شاعر نے اُسے کتنی ہی "بولیاں" سنائی تھیں۔ بولیاں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی تھیں۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔ اُس نے اُسے جی بھر کر پیار دیا تھا۔

اور پھر ٹیچر شاعر اور بزرگ شاعر ایک دوسرے کو اپنی نظمیں اور اشعار سناتے رہے تھے۔

وہ حیران و ششدر پاس بیٹھا ہوا سنتا رہا۔ اس وقت زندگی میں اُسے پہلی بار پتہ چلا کہ ــ شاعر اور چور ــ آدمیوں جیسے آدمی ہوتے ہیں۔ عام آدمیوں جیسے ــ ہاتھ پاؤں والے ــ وہی عام عادتیں جو آدمیوں میں ہوتی ہیں ان میں بھی ہوتی ہیں۔

اسی لیے تو وہ بزرگ شاعر ہنسنے والی بات پر ہنستا تھا اور اداس کر دینے والی بات پر افسردہ ہو جاتا تھا۔

اُس دن اس کے شاعر ہونے پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے شاعر ہونے پر اُسے شک ہوا تھا۔

ایک دن جھجکتے جھجکتے اُس نے بھی ایک نظم کہہ لی تھی۔ لکھی نہیں تھی ــ لکھی گئی تھی۔

ٹیچر شاعر اُس پر بہت خوش ہوا تھا۔" بالکل ٹیگور کا رنگ ــ اچھوتا خیال ــ بیٹا تم ٹیگور بنو گے ــ ہمت نہ ہارنا۔" اُس دن اُسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ٹیگور بن سکتا ہے۔

وہ گیتانجلی کا ترجمہ لایا اور اسے چار بار پڑھا ــ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ــ اور وہ خود کو پھر حقیر سمجھنے لگا ــ کمتر ــ

لیکن ٹیچر شاعر اُسے بڑھاوا دئے جا رہا تھا۔" تم ضرور ایک دن ٹیگور بن جاؤ گے ــ تمہاری نظم جیسی تو اس بابے (بزرگ) کی بھی کوئی نظم نہیں تھی۔"

اُس نے اُس بزرگ شاعر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اب وہ ہر موضوع پر اچھی سے اچھی نظم کہہ سکتا ہے۔

لیکن اب وہ شاعر سے زیادہ ٹیچر ہے اسے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا۔

بدرو کمہار حیران ہو رہا تھا۔

اور پھر اُسے وہ لیڈر یاد آیا جو پڑوس کے گاؤں میں انعامات تقسیم کرنے کے لیے آیا تھا۔ انعام لے لے کر اُس کا دامن بھر گیا تھا۔ کچھ انعامات اُسے اپنے دوست کو تھمانے پڑے تھے۔ وہ اسکول میں فرسٹ آیا تھا۔ دوڑ میں فرسٹ آیا تھا اور شاعری کے مقابلے میں فرسٹ آیا تھا۔

اُس دن اُس پر جنون سوار تھا۔ اُس دن ٹیچر شاعر بے حد خوش تھا۔ اُس نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ میں سے ہی عظیم رہنما اُبھریں گے۔ آپ میں سے ہی کئی مہاتما گاندھی، مہاکوی ٹیگور اُبھریں گے۔ مہاکوی ٹیگور جس کو اس کی ماں نے ٹیگور بنایا۔"

وہ دوڑتا دوڑتا اپنی ماں کے پاس گیا۔ اُس نے اپنے تمام انعام اس کی جھولی میں ڈال دئے۔ اور پھر اس کی باہیں خود بخود اپنی ماں کے گلے میں لپٹ گئیں۔ اور اُس نے بڑے لاڈ چاؤ سے کہا "ماں — ماں — مجھے ٹیگور بنا دو۔"

"کیا؟" اس کی ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"مجھے ٹیگور بنا دو ماں —" اُس نے پھر التجا کی۔

"مور —" اس کی ماں جیسے سمجھ گئی تھی — وہ بولی "مور — بیٹا مور تو تیرے دشمن بھی نہ بنیں۔"

اُسے اپنی ماں پر بہت غصّہ آیا۔

اُسے اس اذیت پسند ماسٹر پر بھی غصہ آیا جو ان کو مور بنایا کرتا تھا۔

وہ ان کی گردن کے پیچھے ان کے ہاتھ بندھوا دیتا اور ہوا میں چھڑی لہراتے ہوئے کہتا "تمہاری ماں کے کڑچھے میں کڑچھا مارا — ہیٹو — بگڑے تگڑوں کا ڈنڈا پیر ہے ... !!

اور اس طرح وہ مور بنے ہوئے گھنٹہ گھنٹہ بھر دھوپ میں جلتے رہتے۔

اور پھر اُسے وہ دن یاد آیا جب اس کے باپ پر فالج گرا تھا اور اس کا آدھا دھڑ بیکار ہو گیا تھا۔ اور اُسے آٹھویں جماعت میں سے اُٹھ کر اپنے باپ کا کام کرنا پڑ گیا تھا۔

شاعر ماسٹر نے اس کے باپ کی بہت منت سماجت کی تھی کہ وہ اسے کم سے کم دسویں کروا لے لیکن اس کے باپ کے ایک ہی جواب نے اسے لاجواب کر دیا تھا — اُس کے باپ نے کہا تھا "ماسٹر جی۔

جہاں روٹی کے لالے پڑے ہوں وہاں پڑھائی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ پہلے پیٹ ہے۔ پڑھائی بعد میں۔"

ماسٹر خفیف سا ہو کر اس کے گھر سے چل پڑا تھا۔

اس دن بدرو کمہار کے اندر آدھا ٹیگور مر چکا تھا۔

اور آج ایک لیڈر اس کے گاؤں میں نئے اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے آ رہا تھا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے گدھے اب بھی آرام سے چر رہے تھے۔ چمنیوں میں سے دھواں اب بھی نکل رہا تھا۔ اُسے دور منشی سائیکل پر آتا دکھائی دیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے آتے ہی اُسے زمین پر پٹک دے۔ لیکن کمتری کے احساس نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ یا شاید اُس کے اندر کے انسان نے اُسے ایسا کرنے سے روکا۔ اُس نے اُٹھ کر گرد جھاڑی۔ مُنہ ہاتھ دھویا۔ اور خاموشی سے پرچی کٹوا کر تیار ہو گیا۔ اُسے اپنے ننگے پیروں پر ترس آ گیا۔ وہ چل چل کر پپڑیوں کی طرح پھٹ گئے تھے۔ ٹانگوں کی پھولی ہوئی نسیں بجلی کے تاروں کی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ صدیوں سے چلتا آ رہا ہو۔

"چلو — شیرو چلو — ابے سالے نیلے — اب راستے میں نہ گر پڑنا۔ کہیں میری ہیٹی نہ کروا دینا۔ گھر چل کر تجھے تیرا راتب دوں گا۔"

نیلا گدھا جو سب سے کمزور تھا اور راستے میں ایک دو بار اینٹوں سے بھری جھول گرا دیا کرتا تھا چابک کھا کر دولتیاں چلاتا ہوا سب سے آگے نکل گیا۔ اس نے پگڑی کے پلو سے گڑ کی ڈلی کھولی اور تھوڑی سی کھا کر دوبارہ پلو میں باندھ لی۔

"گاؤں پہنچ کر اسے کھاؤں گا۔ اور جی بھر کے پانی پیوں گا۔ اور پھر کنوئیں کی منڈھ پر بیٹھ کر لیڈر کی باتیں سنوں گا۔" اُس نے سوچا۔

"ماں یہ تیری شاہی پوشاکیں اور ہیرے جواہرات کی مالا پہن کر کیا کروں — تو مجھے اتنے بیش بہا بندھنوں میں نہ جکڑ — میں تو سنسار کے میلے کی حیات بخش دھول میں کھیلنا چاہتا ہوں!"

اُسے شاعر ماسٹر کے اسکول کی دیوار پر لکھے ہوئے ٹیگور کے اشعار یاد آ گئے۔

"میں تو دھول ہی میں پیدا ہوا، کھیلا اور پلا — لیکن ٹیگور نہ بن سکا۔"

اُس نے قہقہہ لگایا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

گرم گرم ریت اس کے پیروں کو جھلنے لگی — حبس ہو گیا — جیسے کوئی دیو ساری کی ساری ہوا پی گیا ہو۔

اُسے اپنی ماں یاد آئی جو اُمس ہو جانے پر کوٹھے کے اوپر پڑی خدا کا نام لیا کرتی تھی۔

"اے بیرن ہوا چل پڑ۔" اُس نے ہوا کو للکارا۔ سورج کا سرخ گولہ دہک رہا تھا۔

"اے حرامی سورج — کیا تجھے بھی آج ہی چمکنا تھا۔ آج میرے پاؤں جو ننگے ہیں۔ تو خود جلتا ہے اور دوسروں کو جلاتا ہے —" اُس نے جیسے سورج کو طعنہ دیا۔

"اے بادلو — بیٹی کے یارو — آج کہاں مر گئے تم —" اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا —

اوپر اسے ایک بدلی سی آتی ہوئی دکھائی دی — وہ خوش ہو گیا۔ لیکن وہ بدلی نہ جانے کہاں روپوش ہو گئی۔ جیسے بہت سے غریب محرومیوں کے مارے معدوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن آباد دنیا کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔

جس طرح سورج بدلی کی موت سے لاپروا ہو کر دہکتا رہا۔ گدھوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔

"ارے تم سب میری جان کے لاگو ہو گئے۔" غصّے میں آ کر اُس نے گدھوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ رینکتے ہوئے اور دولتیاں چلاتے ہوئے دوڑنے لگے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ جست لگا کر ایک گدھے پر بیٹھ جائے۔ لیکن اس ڈر سے کہ گدھا بیٹھ ہی نہ جائے وہ چلتا رہا۔

سامنے کنواں آ گیا — وہ خوش ہو گیا — اُس نے جی بھر کر پانی پیا۔ پگڑی کے پلّو سے بندھے گڑ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"میں اسے گاؤں جا کر کھاؤں گا اور لیڈر کی بات سنوں گا۔"

اُس نے وہاں کھڑے کھڑے سوچا۔

"کہیں لیڈر آ کر چلا نہ جائے۔" یہ سوچتے سوچتے وہ پھر چل پڑا — اُس نے جو پیر پانی سے گیلے کیے تھے وہ منٹوں میں سوکھ گئے۔ گرم گرم ریت اس کے تلووں کو جھلنے لگی۔ اور پھر اس نے ایک دم چھلانگ لگائی۔ اُسے ایک خیال آیا تھا — وہ دوڑ کر ایک درخت کے قریب گیا۔ اُس کے پتّے توڑے — پگڑی سے ایک چیتھڑا پھاڑ کر درخت کے پتے اُس نے تلووں سے باندھ لیے۔

اب ریت اُسے کم گرم لگ رہی تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔ بائیں ہاتھ کی اُلٹی طرف اس نے ہونٹوں پر رکھ کر نعرہ لگایا۔

ساری فضا گونج اُٹھی — اب بھی جیسے اُس کی تسلی نہ ہوئی —— اُس نے ایک "بولی" کہی۔

"ہاکاں مار دے بکریاں والے (بکریوں والے آوازیں دیتے ہیں
دودھ پی کے جائیں جے کُرے" جے کور دودھ پی کر جانا)

سامنے گاؤں نظر آ رہا تھا۔

وہ بڑے چاؤ سے گاؤں کے گرد و نواح میں داخل ہوا۔ اسکول کے سامنے آموں اور کیلوں کے پتوں کا استقبالی دروازہ تھا — اردگرد رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ خوب گہما گہمی تھی۔ اسکول کے ماسٹر دوڑ دوڑ کر کام کر رہے تھے۔

وہ مستی میں کھڑا دیکھتا رہا۔

اُسے پھر اپنا بچپن یاد آ گیا۔

اُسے وہ شاعر ماسٹر یاد آیا جو اس کو گلے سے لگا لگا کر اور چمکار چمکار کر اس سے کہا کرتا تھا کہ تو ایک دن ضرور ٹیگور بنے گا۔

اُسے وہ بزرگ شاعر یاد آیا جو گاؤں گاؤں لوک گیت جمع کرتا پھرتا تھا۔ جس نے اُسے سینکڑوں لوک گیت زبانی سنائے تھے۔ جو دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے پھر کبھی نہیں آیا تھا۔

کاش وہ کبھی اس سے ملے — وہ اُسے اپنے تازہ گیت ضرور سنائے گا۔

اب وہ ہر موضوع پر اچھی سے اچھی نظم کہہ سکتا تھا۔

لیکن شاعر ماسٹر شاید اُسے سدا دھول میں رہنے والا ایک گھٹیا گھسیارا سمجھتا ہے۔ اس لیے دُور بیٹھا بھی اُس کی نظموں کو نظمیں نہیں مانتا تھا۔ کیونکہ وہ سدا گرد و غبار میں اٹا رہتا ہے — وہ گرد و غبار اور دھول جس میں کھیلنے کے لیے ٹیگور مچھلی کی طرح تڑپتا رہا — ترستا رہا — اُس دھول میں وہ جی رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے نہ جانے کہاں گُم ہو گیا۔

اس کے ہونٹ، اُس کی آنکھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں.... اور وہ خود ایک گیت میں ڈھل گیا۔

وہاں ایک گیت لرز رہا تھا جسے کبھی کوئی اپنے ہونٹوں پر نہیں لایا تھا۔

پھر وہ جیسے کانپ اُٹھا۔

ایک گیت بکھر گیا۔

"ایک مکّہ — دو مکّے —— ایک گھونسا دو گھونسے"

"ٹھہر تجھ کمہاری کی بہن .... سالے تو یہاں کھڑا تماشا دیکھ رہا ہے اور تیرے گدھوں نے میرا کھیت تباہ کر دیا ہے — کتا —"

ایک مُسٹنڈا جاٹ اپنی آنکھیں سرخ کئے اُسے گالیاں دے رہا تھا۔

وہ دم بخود کھڑا رہا۔

جاٹ نے چھکڑے کے پہلو سے ڈنڈا نکالا اور اُس کی طرف دیکھا۔

وہ دہشت کے مارے گدھوں پر ڈنڈے برساتا دھول میں ایک نقطہ کی طرح سمٹ گیا۔

پگڑی کے پلّو سے بندھی گڑ کی ڈلی اس کے ٹخنوں سے ٹکراتی رہی۔

اختتامیہ

نانک سنگھ

پیدائش: ۱۸۹۷ء

کام: تصنیف و تالیف

افسانوں کے مجموعے: آنسوؤں کے ہار، ارمانوں کے ہار، مسلے ہوئے پھول، ٹھنڈی چھاؤں، سنہری جلد، خوابوں کی تربت۔

پتہ: پریت نگر، امرتسر۔

نانک سنگھ پنجابی کے ممتاز ترین ادیب ہیں۔ ان کا زیادہ تر رُجحان ناول نگاری کی طرف رہا ہے۔ شہروں کے درمیانہ طبقہ کے افلاس کی منظر کشی نانک سنگھ کی فنکاری کا نمایاں کردار ہے۔ واقعات کا گہرا اور گٹھا ہوا پلاٹ ان کا فنّی کمال ہے۔ لیکن کہانیوں میں واقعات کا گٹھاؤ ذرا ڈھیلا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نانک سنگھ نے کہانیاں کبھی کبھار لکھی ہیں۔

کہانی "تاش کی عادت" ایک واقعہ کے احتمال پر تعمیر کی گئی ہے جو درمیانہ طبقہ پر صرف ایک پہلو کے ذریعہ نہیں بلکہ کہانی کے مکمل پلاٹ کے ذریعہ طنز کرتی ہے۔

گوربخش سنگھ 'پریت لڑی'

پیدائش: ۱۸۹۵ء

تعلیم: بی۔ ایس۔ سی۔ سی۔ ای (مچی گن ریاست ہائے متحدہ امریکہ)

کام: صحافت

افسانوں کے مجموعے: پریت کہانیاں، ناگ کے پیار کا جادو، انوکھے اور اکیلے، ستار کا نغمہ۔ شبنم، بھابی مینا اور دوسری کہانیاں۔ آخری سبق اور دوسری کہانیاں، محبت کے پہریدار، جن کی رگ رگ میں عشق سرایت ہے۔ زندگی وارث ہے۔

پتہ: پریت نگر۔ امرتسر۔

گوربخش سنگھ شہری زندگی کی عکاسی کرنے والے فنکار ہیں۔ اُنھوں نے پہلی بار پنجابی کو ایک واضح فلسفۂ حیات کی بنیاد عطا کرنے کی کوشش کی۔ اکثر کہانی فلسفے کی آئینہ داری کرتی ہے لیکن کبھی کبھی فلسفہ کہانی کو گہرائی بھی عطا کرتا ہے۔ وہ "عشق حقیقی" کے روحانی فلسفہ سے مارکسزم کے مادیت پسند

فلسفہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی جذباتی یگانگت "عشق حقیقی" سے ہے۔ نتیجتہً ان کی کہانی کی نغمگی یک رُخی تصویر کی طرح ہے جس میں دو رُخی یا ڈرامائی تنوع کو اپنا سر بلند کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کا ذہنی لگاؤ مارکسزم سے ہے۔ محبت اور تنوع فنی تناؤ میں کبھی کبھی رونما ہوتے ہیں۔

کہانی "بھابی مینا" میں "عشقِ حقیقی" ایک بچے کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ ادھیڑ عمر کی محبت کو کمسنی کے تعلق سے پیش کرنا گوربخش سنگھ کا خاص فنی کمال ہے جسے کہانیوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس فنی چابکدستی سے محبت کو پاکیزہ رکھنے کا موقع ملتا ہے۔

سنت سنگھ سیکھوں

پیدائش : ۱۹۰۸ء
تعلیم : ایم۔اے۔ (انگریزی اور معاشیات)
کام : ٹیچر
افسانوں کے مجموعے : خبریں، مزدور اور سورما، بارہ دری، بیچ راستے میں۔ سہ پہر۔
پتہ : پرنسپل گورو گوبند سنگھ ری پبلک کالج۔ جنڈیالہ ضلع جالندھر۔

سنت سنگھوں سیکھوں پنجابی زبان کے ہمہ گیر فنکار ہیں۔ انھوں نے ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک ناول، نظموں کا ایک مجموعہ، ڈراموں اور ایک ایکٹ کے ڈراموں کے بہت سے مجموعے اور کہانیوں کے مجموعے ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان کو سب سے زیادہ شہرت ایک نقاد کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ پنجابی کی ادبی دُنیا میں عمرانیات کی داغ بیل سنت سنگھ سیکھوں نے ہی ڈالی۔ ان کی کچھ کہانیاں جذباتی ہوئے بغیر جذبات کے ماحول کی ترجمانی کر جاتی ہیں "چیمی کے بچے" ان ہی میں سے ایک کہانی ہے۔

گورمکھ سنگھ مسافر

پیدائش : ۱۸۹۹ء
تعلیم : میٹریکولیشن ــ گیانی

کام : سیاست

افسانوں کے مجموعے : ستا تماشا ، سب اچھا ۔ ایک مختلف دُنیا ۔ گھونسلے کے پرندے ، گٹار ، دیواریں بول اُٹھیں ۔

پتہ : ۲۱ ۔ فیروز شاہ روڈ نئی دلی

گورمکھ سنگھ مسافر پنجاب کے سیاسی رہنما بھی ہیں اور ادیب بھی ۔ وہ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی ۔ اپنی زندگی سے متعلق انھوں نے چند تذکرے بھی لکھے ہیں ۔ ان کی کہانیاں زیادہ تر ان کے سیاسی تصورات کے نقوش ہیں ۔ ان میں سیاسی زندگی کی عام صداقتیں تو ملتی ہیں لیکن سیاسی زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ کیا ہے ۔ مسافر دراصل ایک شاعر ہیں اور انھوں نے اپنے مشاہدہ کی شدتِ احساس کو بڑی پاکیزگی سے استعمال کیا ہے ۔

کہانی " ناس پیٹے " ۱۹۴۷ کی تباہی سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کی تلخی کا رخ فرقہ پرستانہ قتل و غارت کی طرف نہیں ہے ۔ بلکہ اپنے نزدیکی ماحول کی طرف ہے ۔ پنجابی کا ادب بیت جانے والے مصائب کو بھول جاتا ہے اور گزرتے ہوئے غم و آلام کی کسک کو محسوس کرتا ہے ۔

سجان سنگھ

پیدائش : ۱۹۰۹ء

تعلیم : ایم ۔ اے ۔ (پنجابی)

کام : ٹیچر

افسانوں کے مجموعے : دکھ سکھ ، دکھ سکھ کے بعد ، سب رنگ ، جہنم کے دیوتا ، انسان اور حیوان ، نیا رنگ

پتہ : پرنسپل لاجپت رائے میموریل کالج ۔ ڈھوڈیکے ضلع فیروز پور ۔

سجان سنگھ پنجابی زبان کے ممتاز ترین ترقی پسند ادیب ہیں ۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ " دکھ سکھ " ۔ ان کی فنی پختگی کی شہادت ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا پیش رو بننے کا عزمِ صمیم کیا اور پھر اُن کی مجموعی فنی ریاضت مارکسزم کے فلسفہ کے تحت کام کرتی رہی ۔ اب وہ کچھ سالوں سے خاموش ہیں ۔ اُن کی بیشتر کہانیاں زندگی کے واقعات سے متعلق ہیں اور نچلے طبقہ کے لیے اپنی ہمدردی کا واضح اور مضبوط اظہار کرتی ہیں ۔ کہانی " راس لیلا " اُن کے افسانوں کے پہلے مجموعہ سے تعلق رکھتی ہے ۔

کرتار سنگھ دوگل

پیدائش : ۱۹۱۷ء
تعلیم : ایم ۔اے ۔ (انگریزی)
کام : سیکرٹری نیشنل بک ٹرسٹ ۔ انڈیا۔
افسانوں کے مجموعے : صبح سویرے، پیپل کے پتے ، لڑکی افسانہ چھیڑتی رہی ، ڈنگر ، آگ کھانے والے، نیا گھر ، نیا آدمی ، کچا دودھ ، پھول توڑنا منع ہے ، جنگ نہیں ہوگی ، کرامات ، گیرج ، پارے میرے ، روشنی کا ایک پرتو ، ہم سب شریک کار ہیں ۔
پتہ : سیکرٹری نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۔ گرین پارک نئی دلّی ۔

کرتار سنگھ دوگل پنجابی زبان کے ہمہ گیر فنکار ہیں ۔ اُنھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں ۔ وہ بہت سے ناولوں اور ڈراموں کے مصنّف ہیں ۔ ان کے ناولوں اور ڈراموں نے بھی بہت شہرت حاصل کی ، لیکن ان کا زیادہ تر ذکر ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے ۔ ان کی افسانہ نگاری ایک اٹوٹ دھارے کی طرح جاری رہی ہے ۔ گذشتہ تیس سال کے پنجابی ادب کے رُجحانات کی تاریخ ان کی کہانیوں میں جھلکتی ہے ۔

"کرامات" اُن چند کہانیوں میں سے ہے جو پنجابی دیو مالا اور تاریخ کو دانشمندی کی سطح پر پیش کرتی ہیں ۔

دیوندر ستیارتھی

پیدائش : ۱۹۰۸ء
کام : تصنیف و تالیف
افسانوں کے مجموعے : کُنگ پوش ، سونا گاچی ، تین دروازوں والا گھر ، پیرس کا آدمی ۔
پتہ : کلپنا ۔ روہتک روڈ ۔ دلّی ۔ ۳۵ ۔

دیوندر ستیارتھی بہت سی زبانوں کے ہمہ گیر ادیب ہیں ۔ نظموں اور افسانوں کے بہت سے

مجموعے ان کے قلم کے مرہون منت ہیں۔ ان کو زیادہ تر شہرت لوک گیتوں کے مرتب اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے نصیب ہوئی۔ گذشتہ کئی سالوں سے دیوندر ستیارتھی نظم و افسانہ کا ریاض باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ اپنی تخلیقی انفرادیت کے باعث ستیارتھی ادب کے قارئین سے کچھ فاصلے پر ہی رہتے ہیں۔ ان سے واضح جذباتی اشتراک کے لیے کڑی ریاضت کی ضرورت ہے۔ مسلسل تجربہ دیوندر ستیارتھی کا نظریۂ ادب ہے۔

"دسوندھا سنگھ" ان چند منتخب کہانیوں میں ایک ہے جس میں دھرتی اور موسم کو بھی ایک انسانی کردار کی طرح افسانہ کے پلاٹ میں شامل کیے جانے کا موقع ملا ہے۔ یاد رہے کہ اس کہانی میں دھرتی اور موسم پنجاب کے نہیں بلکہ پنجاب کے باہر کے ہیں۔

کلونت سنگھ ورک

پیدائش : ۱۹۲۱ء
تعلیم : ایم۔ اے۔ (انگریزی) ایل۔ ایل۔ بی۔
کام : سرکاری ملازمت (انفارمیشن آفیسر۔ حکومتِ ہند)
افسانوں کے مجموعے : منہ اندھیرے، دھرتی اور آکاش، بھوسے کی گٹھڑی، ہم خدائے دو جہاں کے بندے، بارک دودھ کا جوہڑ، گولاں، نئے لوگ۔
پتہ : ۱۴۸ سیکٹر ۱۱ — اے چنڈی گڑھ

کلونت سنگھ ورک نے صرف کہانیاں لکھی ہیں۔ افسانہ نگار ورک دیہی پنجاب اور کسانوں کے کردار سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ کہانی کے انجام پر ایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والے واقعے کے ذریعہ سے نئی قدر کو نمایاں کرنا ورک کا یکتا فن افسانہ نگاری ہے۔

کہانی "جھاڑ جھنکاڑ" ایک پنجابی جاٹ کے کردار کا مضبوط و توانا نقش ہے۔ اس کہانی کا اہم کردار جاٹ ہے، اس کا مجموعی گرد و پیش اور نفسیاتی ماحول جاٹوں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ اس کا اہم ترین کنایہ "جھاڑ جھنکاڑ" بھی اسی زندگی سے وابستہ ہے۔ مصائب جھیل کر بھی زمین سے چپکے رہنے کی خواہش اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔

امرتہ پریتم

پیدائش : ۱۹۱۹ء

: تصنیف و تالیف

افسانوں کے مجموعے : ۲۶ سال بعد ، آخری خط ، گوجر کی پریاں ، روشنی کی کراہیں ، جنگلی بوٹی ۔

پتہ : کے ۔ ۲۵ حوض خاص نئی دلّی ۔ ۱۶ ۔

امرتہ پریتم پنجاب کی ممتاز ترین شاعرہ ہیں ۔ افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں ۔ اُنھوں نے کچھ مقالے تاثراتی تنقیدی مضامین اور سفر نامے بھی لکھے ہیں ۔ "ناگ منی" ماہنامہ کے ذریعہ ایک نئی قسم کی صحافت کی بنیاد بھی رکھی ہے ۔ گہری اور پُر تاثیر ریاضتِ شعر و سخن امرتہ پریتم کے ادراکِ حیات کا جزو لاینفک ہے ۔ بے باکی و صاف گوئی اور باشعور اظہار اُن کی شاعری اور ان کی افسانہ نگاری کے مشترک اوصاف ہیں ۔

کہانی "ایک حسرت ایک آہ" بھی ایک خوب صورت اور جوان عورت کی سماج کی طرف سے ممنوع حرکت کی بے باک عکاسی سے تعلق رکھتی ہے ۔

سنتوکھ سنگھ دھیر

پیدائش : ۱۹۲۰ء

تعلیم : میٹریکولیشن

ذریعۂ معاش : تصنیف و تالیف

افسانوں کے مجموعے : مٹّی کی چھاؤں ، سانجھی دیوار ، صبح ہونے تک ۔

پتہ : منڈی گوبند گڑھ ۔ پنجاب

سنتوکھ سنگھ دھیر پنجابی ادب کی ترقی پسند تحریک کی پیداوار ہیں ۔ اُنہوں نے پنجابی کی شاعری اور افسانہ نگاری میں خاصا نام پیدا کیا ۔

انھوں نے ایک ناول بھی لکھا ۔ اب کچھ سالوں سے تقریباً خاموش ہیں ۔ ان کے افسانے گنتی میں کم ہیں ۔ لیکن ان میں سے پانچ چھ کہانیاں کسی بھی افسانوی ادب میں ممتاز مقام پانے کی مستحق

ہیں ۔ان کے افسانے دیہات کے دکھ سکھ سے متعلق ہیں ۔ماحول کی دلآویز عکاسی سنتوکھ سنگھ دھیر کے افسانوں کا منفرد حسن ہے ۔

"صبح ہونے تک" واقعہ سے زیادہ واقعہ کے امکانات سے وابستہ کہانی ہے ۔فرد کی کردار نگاری سے صورتِ حال کی عکاسی زیادہ کی گئی ہے اور پُر مصائب زندگی کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے ۔

مہندر سنگھ سرنا

پیدائش : ۱۹۲۴ء

تعلیم : بی ۔ اے

ذریعۂ معاش : سرکاری ملازمت (ڈائریکٹوریٹ آف آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس ۔ نئی دلّی)

افسانوں کے مجموعے : پتھر کے آدمی ، نیک شگون کی سحر ، خوابوں کی حد ، بانسری اور نوحہ ، چھویوں کی رُت ، کانکا

پتہ : ایس ۔ ۱۹ گریٹر کیلاش ۔ نئی دلّی ۔

مہندر سنگھ سرنا افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نویس بھی ۔آج کل رزمیہ نظم کی صنف میں ایک طویل نظم کہہ رہے ہیں ۔سرنا کی کہانیوں کی اہم بنیاد علم نفسیات ہے ۔ ڈھلی اور ترشی ہوئی زبان ان کے فن کا اہم ذریعہ ہے ۔ان کی کہانیوں میں ۱۹۴۷ کی تباہی بار بار نمایاں ہوئی ہے ۔گہرا احساس کبھی کبھی جذباتیت کی سرحدوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔تیکھی طنز اس جذباتیت کو اور وسعت دیتی ہے ۔تلخ اور شیریں انسان دوستی کا امتزاج سرنا کی انفرادیت ہے ۔

"چھویوں کی رُت" ملک کی تقسیم سے متعلق خون میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے ۔فرقہ پرست رہنماؤں کی سنگدلی ، پُرانی قدروں کو ماننے والوں کی عام نرمی اور ملائمت اور ان دونوں کے درمیان مقیّد اپنی مرضی سے محروم لوگوں کی بے بسی کا امتزاج اس کہانی میں نمایاں کیا گیا ہے ۔اپنے اس گہرے امتزاج کے باعث ہی یہ کہانی ایک نظم معلوم ہوتی ہے ۔

نوتیج سنگھ

پیدائش : ۱۹۲۴ء

تعلیم : ایم ۔ اے ۔ (نفسیات)

ذریعۂ معاش : صحافت (مدیر - پریت لڑی)
افسانوں کے مجموعے : دیس کو واپسی، نیا موسم، باسمتی کی مہک، روشنی کے بیج۔
پتہ : پریت نگر - امرتسر۔

نفسیات کے طالب علم نوتیج سنگھ کی اولین وفاداری مارکسزم سے ہے۔ سیاسی صحافت کے باوجود وہ اصل میں شاعرانہ تخیل سے محبت کرتے ہیں۔ نوتیج کے افسانوں میں دیہی مسائل کو شہری نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے۔ نوتیج سنگھ روزمرہ کے سنگدل حقائق کو تخیلی خاکوں اور تمثیلوں کے ذریعہ پیش کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ نتیجتہً اُن کی کہانی کا تاثر ایک خاص نقطہ پر مرکوز نہ ہوتے ہوئے کہانی کے پورے ماحول میں بکھرا رہتا ہے اور کہانی کا تاثر نظم کی طرح ہوتا ہے۔

"قسمت کی ڈور" — دیہی توہمات سے متعلق شہری شعور کی روداد ہے — وہم خالص طور پر آدمی کی اپنی نفسیاتی الجھنوں کی پیداوار ہے۔ اس کا ایک سرا روزمرہ کی ضروریات سے بندھا ہوا ہے اور دوسرا سرا انسان کے تحت الشعور میں آباد نفسیاتی دُنیا سے۔ تصور اور حقیقت کا امتزاج نوتیج کی کہانی کی انفرادیت ہے۔

مہندر سنگھ جوشی

پیدائش : ۱۹۱۹ء
تعلیم : ایم - اے - (پنجابی) ایل - ایل بی
ذریعۂ معاش : سرکاری ملازمت (ممبر آفیشل لینگویج لیجسلیٹو کمیشن)
افسانوں کے مجموعے : پیار کی پرچھائیاں، حسرتیں اور ان کی تکمیل، دل سے دور، کرنوں کی راکھ، مجھے اپنی قسم۔
پتہ : ۴ - ۲ ملٹی سٹوری بلڈنگ شاہجہاں روڈ - نئی دلّی — ۱۱

۱۹۴۷ء کے بعد پنجاب کے علاقہ مالوہ کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع ملا اور اس سے پنجابی ادب کی ہیئت کی تاثیر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اور یہ کام زیادہ تر کہانی کے میدان میں ہوا۔ جوشی مالوہ کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے مالوہ کے محسوسات و جذبات اور بولی کو فنی اور ادبی ارتقا عطا کیا ہے۔ ان کی بہت سی کہانیاں اسی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ماضی پر نظر اور الفاظ و معانی کی گہری یگانگت جوشی کے افسانوں کے خاص اوصاف ہیں۔ ماضی پر نظر کی بدولت ہی افسانہ کی رفتار منفرد معلوم ہوتی

ہے اور ان کو ذرا بلند ادراک و شعور سے پڑھنا پڑتا ہے۔

کہانی موتی ۱۹۴۷ء کی تباہی سے متعلق ایک کہانی ہے۔ جس میں ماضی کے تین زمانے مل کر ایک جذباتی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔

لوچن بخشی

پیدائش : ۱۹۲۳ء

تعلیم : بی۔ اے

ذریعۂ معاش : سرکاری ملازمت (پروگرام ایگزیکٹو آل انڈیا ریڈیو)

افسانے کے مجموعے : گناہ و ثواب سے دور، وردان اور سراپ، بھرے میلہ میں۔ میری خوشی لوٹا دو۔

پتہ : پروگرام ایگزیکٹو۔ آکاش وانی۔ نئی دلّی۔

لوچن بخشی ایک طویل عرصہ سے مگر بڑی سست رفتاری سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ انھیں پوٹھوہار کی رنگ و نوا سے بھرپور سرزمین بہت عزیز ہے اور وہ رمز و کنایہ کے ذریعہ حقیقت کے اظہار کی رغبت رکھتے ہیں۔ نتیجۃً کہانی کا تاثر بھرپور ہوتا ہے۔ افسانوی رس سے شعری رس آسانی سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت پر رومان کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ لوچن بخشی زیادہ تر اپنے طویل افسانوں کے لیے مشہور ہیں۔

"بازار کا ماتم" لوچن بخشی کی اشاراتی کہانی ہے۔ زندگی کو نیم انسانی ذریعہ اظہار سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اہم کردار ہے۔ بازاری قیمت۔

گوردیال سنگھ

پیدائش : ۱۹۳۳ء

تعلیم : ایم۔ اے (پنجابی)

ذریعۂ معاش : درس و تدریس۔

افسانوں کے مجموعے : بقلم خود ، چونک پھول ، پرایا گھر۔

پتہ : جیتو، پنجاب

گوردیال سنگھ مالوہ کے علاقہ کے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ناول "چراغ لحد" کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ جس نے مالوہ کے علاقے کے جغرافیائی خدوخال کی عکاسی کی۔ ان کی تمام تخلیقات مالوہ کی سرزمین کے بے زمین لوگوں سے متعلق ہیں۔ بے زمین لوگوں کے دوامی مصائب کی بے لاگ عکاسی گوردیال سنگھ کے افسانوں کی انفرادیت ہے۔ گوردیال سنگھ نے اس قسم کے بے زمین لوگوں کے لیے ایک نام تجویز کیا ہے "پیدا ہی نہیں ہوئے" وجود سے انفرادیت کی طرف ناکام مسافت کو گوردیال سنگھ نے پہلی بار پنجابی کے افسانوی ادب میں بلند مقام عطا کیا ہے۔ مالوہ کی علاقائی زبان کے استعمال کی بدولت وہ پنجاب کے یکتا اور منفرد فنکار کہلانے کے مستحق ہیں۔ جذباتی ہوئے بغیر جذبات کو اُبھارنا گوردیال سنگھ کی خاص صلاحیت ہے۔

"پھانس" ایک ایسے وجود کے احتجاج کی کہانی ہے۔ جو ابھی ظہور پذیر نہیں ہوا۔

اجیت کور

پیدائش : ۱۹۳۴ء

تعلیم : ایم۔ اے (معاشیات)

ذریعہ معاش : صحافت

افسانوں کے مجموعے : گل بانو، خوشبو کی موت، بُت شکن۔

پتہ : ۱۶/۶ ایسٹ پٹیل نگر نئی دلی۔ ۸۔

اجیت کور شہری عورت کے نفسیاتی کرب و اضطراب کو پیش کرتی ہیں۔ معاشی، سماجی اور خالص جذباتی آلام و مصائب تو ساری دُنیا برداشت کرتی ہے لیکن کچھ رنج و آلام ایسے ہیں جو عورت صرف عورت ہونے کی وجہ سے برداشت کرتی ہے۔ معاشی طور پر خود کفیل ماحول میں رہنے اور سماجی روک ٹوک سے اپنے طاقتور حوصلہ کے باعث آزاد ہونے کے باوجود شہری عورت کے لیے کچھ ایسے دکھ بھی ہوتے ہیں جن کا علاج نہ تو معاشی جائیداد کے پاس ہوتا ہے اور نہ ہی سماجی آزادی کے پاس۔ اجیت کور نے اپنی کہانیوں میں ان ہی دکھوں کی عکاسی کی ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر شہری عورت

کے لیے ہمدردی شاید ہمیشہ نہ اُبھرے لیکن اس کے کردار میں مصیبت کے بوجھ کو ضرور پہچانا جا سکتا ہے۔

"سولی پر لٹکے ہوئے لمحے" خود کفیل، آزاد اور بلند حوصلہ شہری عورت کی مصیبت کا افسانہ ہے۔

گلزار سنگھ سندھو

پیدائش : ۱۹۳۴ء

تعلیم : ایم۔اے (انگریزی)

ذریعہ معاش : سرکاری ملازمت (ایڈیٹر۔ وزارت زراعت۔ حکومت ہند)

افسانوں کے مجموعے : حسن عین ہمسر، ایک پرانا اشتراک، سونے کی اینٹ۔

پتہ : اے۔ ۲۴۶ پنڈارہ روڈ۔ نئی دلی ۱۱۔

گلزار سنگھ سندھو اپنی عمر کے لحاظ سے افسانہ نگاروں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جذبات واحساسات اور تخلیقی رجحان کے اعتبار سے سکھوں کی افسانہ نگاری کے پیرو ہیں۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ شہروں میں بسر کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کا جذباتی لگاؤ پنجاب کے دیہات کی زندگی سے ہے گاؤں کی زندگی کے مسائل سے زیادہ وہ دیہی ماحول کے افسانہ نگار ہیں۔ پنجاب کے دیہات نے اپنے مسائل کم وبیش حل کر لیے ہیں۔ گاؤں کے فرد کا فرد کے روپ میں مطالعہ ابھی ہمارے افسانہ نگاروں نے شروع نہیں کیا ہے۔ دیہات سے متعلق ہماری کہانیاں زیادہ تر دیہاتیوں کے تحت الشعور میں پنہاں جذبات سے متعلق ہیں۔

"ٹھگی" اُن چیدہ کہانیوں میں سے ایک ہے جس میں نئے پنجاب کے اُبھرتے ہوئے رنگ روپ کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع ملا ہے۔ نیا بھاکڑہ ڈیم پُرانے جذباتی رجحان سے وابستہ کیے جانے کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ بیمار بڑی بوڑھی "بے بے" کی تمام مصیبت کسی واقعہ یا مسئلہ سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود جذباتیت سے وابستہ ہے۔ یہ جذباتی یگانگت انفرادی نہیں بلکہ پنجاب کے مجموعی کاشتکار طبقہ سے متعلق ہے۔

دلیپ کور ٹوانہ

پیدائش : ۱۹۳۴ء
تعلیم : ایم ۔ اے (پنجابی) پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔
ذریعہ معاش : درس و تدریس (لیکچرار پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ)
افسانوں کے مجموعے : ٹیسیں، کسی کی بیٹی، بیمار آنکھیں، یاترا ۔ ویدنا،
پتہ : سمپورن لاج ۔ پٹیالہ

دلیپ کور ٹوانہ نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور دو ناول بھی ۔ ان کی شہرت کی بنیاد ان کا ناول "یہ ہماری زندگی" ہے ۔ پنجاب کی دوسری دو خاتون افسانہ نگاروں (امرتہ پریتم اور اجیت کور) کی طرح دلیپ کور کی کہانیاں بھی جوان عورت کی محبت کے محسوسات سے متعلق ہیں ۔ جوانی کے پیار سے ذرا ہٹ کر لکھنے کا رجحان ان افسانہ نگار خواتین کی مشترک خوبی ہے ۔ جہاں امرتہ پریتم اور اجیت کور کی کہانیوں کا اختتامی تاثر بے باکی سے متعلق ہے وہاں دلیپ کور ٹوانہ کی کہانیوں کے انجام کا تاثر سنجیدگی سے متعلق ہے ۔

"مرنے کا موسم" بھی ایک بھرپور جوانی اور محبت کے احساس کی کہانی ہے ۔ پیار اور ہوس کے نقطۂ اتصال کی عدم موجودگی کے باعث تناؤ پیدا ہوتا ہے لیکن اس عدم موجودگی کی پہچان کے ذریعہ تناؤ پر قابو پا لیا جاتا ہے ۔

بوٹا سنگھ

پیدائش : ۱۹۱۹ء
تعلیم : ایم ۔ اے (پنجابی)
ذریعۂ معاش : سرکاری ملازمت (ٹرین ایگزامینر، ریلوے سٹیشن دلّی)
افسانوں کا مجموعہ : چوبارے کی روشنی ۔

بوٹا سنگھ کی کہانیوں کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا ہے لیکن گذشتہ کئی برس سے اُس کی کہانیاں ایک دھارے کے بہاؤ کی طرح پنجابی رسائل میں چھپتی رہی ہیں ۔ آج کل وہ ایک ناول چھپوانے میں مصروف ہیں ۔ ان کی کہانیاں زیادہ تر شہر کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں ۔ وہ زندگی کے کسی

انوکھے واقعہ کو اپنی کہانی کا موضوع بنانے کا خاص رجحان رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی رنگ میں ممنوع جنسی تلذذ ان کی کہانیوں میں نمودار ہو ہی جاتا ہے۔

"مائی سدھراں" ان کی ابتدائی کہانیوں میں سے ہے۔ اس افسانہ نگار کی شہرت کی ابتدائی بنیاد یہی کہانی ہے۔ بوٹا سنگھ چونکہ ریلوے شنٹنگ لائن سے وابستہ ہیں اس لیے انھوں نے وہاں کی زندگی کو نزدیک سے دیکھا ہے جو اس کہانی میں آسانی سے نمایاں ہو گئی ہے۔

جسونت سنگھ وردی

پیدائش : ۱۹۳۴ء

تعلیم : ایم۔ اے (ہندی)

ذریعۂ معاش : سرکاری ملازمت (ایڈیٹر ہندی۔ شعبۂ تعلیم۔ حکومت پنجاب)

افسانوں کے مجموعے : پرایا درد، اپنی اپنی حد،

پتہ : ایڈیٹر ہندی شعبۂ تعلیم حکومت پنجاب۔ چنڈی گڈھ

جسونت سنگھ وردی نئی پود کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنے مشاہدے میں غیر جانب دار اور اپنے اظہار میں پختہ ہیں۔ ان کے ارتقاء کا سفر ان کے تجرباتی رجحان کی تصدیق کرتا ہے۔ ان کی اصل شہرت کی بنیاد ان کی تمثیلی کہانی "تارے توڑنا" ہے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی کہانی کو واقعہ اور کردار کے بندھن سے آزاد کیا ہے۔ وردی کی کہانیوں میں واقعہ اور کردار کو آزادانہ روپ میں نہیں پیش کیا جاتا۔ بلکہ مشترک زندگی کو غیر جذباتی اور غیر جانب دار نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے اور یہی وردی کے افسانہ کا منفرد رنگ ہے۔

کہانی "اپنی اپنی حد" میں جدید زندگی کی غیر جانب داری سے عکاسی کی گئی ہے۔ یہ نہ تو خالص طور پر عورت کی کہانی ہے اور نہ یہ مرد کا افسانہ ہے اور اس میں مسئلہ کو نہ صرف عورت کے نقطۂ نظر سے اور نہ صرف مرد کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ دونوں نقطہ ہائے نظر میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔ یہ خالص طور پر جدید احساس کا افسانہ ہے۔ جس میں انفرادی طور پر ہر انسان کو اس کی اپنی حد میں پیش کیا گیا ہے۔

موہن بھنڈاری

پیدائش : ۱۹۳۷ء

تعلیم : بی۔اے۔ایل۔ایل بی

ذریعۂ معاش : سرکاری ملازمت (محکمۂ تعلیم۔پنجاب)

افسانوں کے مجموعے : تِل چاولی۔ انسان کا درد

پتہ : ۱۳۸۵۔اے۔۲۰۔بی سیکٹر چنڈی گڑھ

موہن بھنڈاری نئی پود کے اُبھرتے ہوئے ادیبوں میں سے ہیں۔ان کا فن جدید و قدیم کے درمیان ایک امتیازی خط پر قائم دکھائی دیتا ہے۔

مالوہ کے علاقہ کے دیہاتی مگر بے زمین طبقہ کے لوگ ان کی کہانیوں کے اہم ترین موضوع ہیں۔ وہ بے زمین طبقہ کے لوگوں کے مصائب کو ہمدردی اور طنز کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔عام مزاحیہ زبان ان کا نمایاں وصف ہے۔

کہانی "مجھے ٹیگور بنا دو ماں!" میں گاؤں کے ایک کمہار کی ایک مشترک اور عام جستجو کو اور اس کے منفرد کردار کو ملے جُلے روپ میں پیش کیا گیا ہے جس کے باعث کہانی کے اختتام کا تاثر قدیم اندازِ فکر کے قریب پہنچ کر بھی جدید فکر و خیال کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی اردو مطبوعات

بھارت۔ دیش اور لوگ

۱۔ آبادی	ایس، این، اگروال	۵-۲۵

قومی سوانح حیات کا سلسلہ

۲۔ پنڈت وشنو دگمبر	وی، آر، اٹھاولے	۲-۲۵
۳۔ کبیر	پارس ناتھ تواری	۲-۵۰
۴۔ گورو نانک دیو	گوپال سنگھ	۳-۲۵
۵۔ قاضی نذرالاسلام	بسودھا چکرورتی	۲-۲۵
۶۔ رنجیت سنگھ	ڑی، آر، سود	۲-۷۵

نہرو بال پستکالیہ (بچوں کے لیے کتابیں)

۷۔ باپو (پہلا حصہ)	الیف، سی، فرتیاس	۱-۵۰
۸۔ باپو (دوسرا حصہ)	الیف، سی، فرتیاس	۱-۵۰
۹۔ کشمیر	مالا سنگھ	۱-۵۰

۱۰۔ رسیلی کہانیاں	منوج داس	۱-۵۰
۱۱۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر	گیان سنگھ	۱-۵۰
۱۲۔ جنّت کی سیر	لیلا بھاگوت	۱-۵۰
۱۲۔ ہماری ندیوں کی کہانی	لیلا مجمدار	۱-۵۰
۱۴۔ پرندوں کی دنیا	جمال آرا	۱-۵۰

آدان-پردان

۱۵۔ مٹتی بنتی تصویریں	بھگوتی چرن ورما	۵-۰
۱۶۔ پنجابی افسانے	(مرتبہ) ہربھجن سنگھ	۷-۰

متفرق

۱۷۔ گاندھی کا ہندوستان کثرت میں وحدت		۲-۲۵
۱۸۔ اکبر	لارنس بینن	۳-۵۰
۱۹۔ عظیم باغی	ڈینس کنکیڈ	۶-۲۵
۲۰۔ کچھوا اور خرگوش (بچّوں کے لیے)	ذاکر حسین	عام ایڈیشن ۱-۰ خاص ایڈیشن ۲-۰

عقابی

۲۱۔ ہندوستان میں تعلیم کی ازسرنو تنظیم	ذاکر حسین	۱ - ۲۵
۲۲۔ کل کی تہذیب کا مستقبل	ایس ، رادھاکرشنن	۲ - ۲۵
۲۳۔ سائنس کے چند پہلو	سی ، وی ، رمن	۱ - ۲۵
۲۴ - بھارت آج اور کل	جواہر لال نہرو	۰ - ۷۵
۲۵۔ دو شہروں کی کہانی	چارلس ڈکنس	۵ - ۰
۲۶۔ جوالا مکھی	اے۔ جی۔ شیوڑے	۲ - ۵۰
۲۷۔ ہندوستانی ڈرامہ	صفدر آہ	۳ - ۷۵

عقابی

UQAABI

اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کی کچھ منتخب معیاری اور عام پسند کتابوں کا ترجمہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں کیا جائے اور اس کے ذریعہ اس خاص علاقے اور وہاں کے رہنے والوں کی تہذیب، اُن کے رہن سہن، رسم و رواج، غم اور خوشی کا تعارف دوسرے علاقوں کے پڑھنے والوں سے کرایا جا سکے۔ کتابوں کا انتخاب اِسی مقصد کے پیشِ نظر کیا جائے گا اور عام طور پر کتابیں حالیہ دور اور عصری ادب سے لی جائیں گی۔

ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پڑوسی زبانوں کے اظہارِ خیال یا تہذیبی اور سماجی دھاراؤں سے ہم بہت کم واقف ہیں اور اس طرف توجہ بھی کم دی گئی ہے۔ یورپ جیسے برِّاعظم میں جہاں الگ الگ ملک ہیں اور اُن کی زبانیں بھی مختلف ہیں یہ ممالک اس سے کہیں زیادہ روابط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو ادبی اور تہذیبی سطح پر متاثر کرتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ اس قسم کے ربط سے ہمارے مختلف لسانی علاقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں مدد ملے گی اور وہ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں گے۔ قومی یکجہتی کے کام میں بھی اس سے مدد ملے گی۔